مسلسل اشاعت کے 60 سال

جمادی الاولیٰ ۱۴۴۸ھ

اکتوبر ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حقیقتِ نفاق از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
- اقوامِ متحدہ کے بعد کیا؟
- میثاقِ مکّہ سے میثاقِ اُمت تک
- حُسنِ اَخلاق کے ثمرات
- روح کا سفر اور حالاتِ برزخ
- مشرقِ وسطیٰ کی پھیلتی جنگ اور ہمارے مسائل
- احیائی تحریکیں اور قیادت کا امتحان
- بچے: اقتدار سے زیادہ اہم!

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت

کے بعد اب پیش ہے:

مختصر

بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1250 روپے

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	75
شمارہ	:	10
جمادی الاولیٰ		1448ھ
اکتوبر		2026ء
فی شمارہ	:	60 روپے
سالانہ زرِتعاون	:	600 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
● رضاءالحق ● ایوب بیگ مرزا
● خورشید انجم ● وسیم احمد

معاون مدیران
● محمد خلیق ● حافظ محمد زاہد

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

پبلشر: سکریٹری دینِ حق ٹرسٹ، لاہور مطبع: آر آر پرنٹرز، سگیاں روڈ، لاہور

مشمولات

عرضِ احوال ———— 5

اقوامِ متحدہ کے بعد کیا؟ — رضاء الحق

ابوظبی سیریز (۷) ———— 9

حقیقتِ نفاق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

درسِ قرآن ———— 25

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۱۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب ———— 40

روح کا سفر اور حالاتِ برزخ — شجاع الدین شیخ

ظروف و احوال ———— 52

مشرقِ وسطیٰ کی پھیلتی جنگ اور ہمارے مسائل — ایوب بیگ مرزا

ایک ہوں مسلم ...... ———— 62

میثاقِ مکّہ سے میثاقِ اُمّت تک — ڈاکٹر ضمیر اختر خان

دعوت و تحریک ———— 71

احیائی تحریکیں اور قیادت کا امتحان — ڈاکٹر فواد لوہانی

حسنِ معاشرت ———— 78

حُسنِ اَخلاق کے ثمرات — احمد علی محمودی

تذکیر و موعظت ———— 85

ندامت کے آنسو: خطا کار کا قیمتی سرمایہ — حافظ محمد اسد

دعوتِ فکر ———— 90

بچے: اقتدار سے زیادہ اہم! — خالد نجیب خان

تہذیبِ فرنگ ———— 95

قدیم انگلینڈ میں بیویوں کی خرید و فروخت — رضی الدین سید

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقوامِ متحدہ کے بعد کیا؟

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سالانہ عمومی اجلاس ستمبر کے آخری عشرے میں نیویارک میں منعقد ہوا۔ دنیا بھر سے سربراہانِ مملکت وحکومت اور اُن کے نمائندگان اس عالمی فورم پر جمع ہوئے‘ اپنے اپنے ممالک کا موقف پیش کیا۔ عالمی امن‘ جنگوں‘ انسانی حقوق‘ معاشی مسائل اور بین الاقوامی تعاون پر اظہارِ خیال کیا اور حسبِ روایت مسائل کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ دنیا کے بعض طاقتور ممالک کے سربراہان کی تقاریر کے دوران ہال کی بہت سی نشستیں خالی دکھائی دیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے مقرر پوری دنیا سے مخاطب ہے مگر دنیا اس کی بات سننے کے لیے موجود نہیں۔ سوال یہ نہیں کہ اقوامِ متحدہ کے ہال میں کتنی کرسیاں خالی تھیں‘ بلکہ یہ ہے کہ کیا عالمی امن‘ انسانی حقوق‘ مساوات‘ بین الاقوامی قانون اور باہمی احترام کے وہ تصورات جن کے نام پر یہ ادارہ قائم ہوا تھا‘ آج بھی اُسی قوت کے ساتھ موجود ہیں؟ یا پھر اقوامِ متحدہ کی عمارت تو قائم ہے‘ اجلاس بھی ہو رہے ہیں‘ قراردادیں بھی منظور ہو رہی ہیں‘ مگر دنیا اس ادارے کی آواز سننے کی صلاحیت بتدریج کھو چکی ہے؟

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر جب اقوامِ متحدہ کا عالمی ادارہ معرضِ وجود میں آیا تو اس کے بنیادی مقاصد میں بین الاقوامی امن وسلامتی کا قیام‘ جنگوں کی روک تھام‘ انسانی حقوق کا تحفظ‘ بین الاقوامی قانون کی پاس داری اور ممالک کے درمیان تعاون کا فروغ بتایا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر لیگ آف نیشنز بھی اِسی امید کے ساتھ قائم کی گئی تھی کہ انسانیت کو ایک اور عالمی جنگ کی ہولناکی سے محفوظ رکھا جا سکے‘ لیکن وہ عالمی طاقتوں کے مفادات اور جارحیت کے سامنے بے بس ثابت ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بنے‘ معیشتیں تباہ ہوئیں اور بالآخر انسان نے ایک مرتبہ پھر یہ ’’عہد‘‘ کیا کہ آئندہ ایسی تباہی کو

روکا جائے گا۔ ادارے قائم کرنا تو آسان ہے‘ مگر اُنہیں ان کے مقاصد کے مطابق چلانا مشکل ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کو قائم ہوئے ۸۱ برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران دنیا نے ہر میدان میں غیر معمولی ترقی کی‘ مگر جنگ کے معاملے میں انسان آج بھی اُسی مقام پر کھڑا دکھائی دیتا ہے جہاں وہ صدیوں پہلے کھڑا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج انسان کے پاس ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے زیادہ ’’مؤثر‘‘ ذرائع موجود ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے قیام کے وقت ۵۱ ممالک اس کے رکن تھے جبکہ آج یہ تعداد ۱۹۳ ہو چکی ہے۔ یہ اضافہ دُنیا کی سیاسی تقسیم اور بعض علاقوں کی تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں ہوا۔ اِس کے ساتھ دنیا میں ایسے خطے بھی موجود ہیں جو خود کو آزاد ریاستیں سمجھتے یا عملاً اپنی حکومتیں تو چلاتے ہیں‘ مگر اقوامِ متحدہ کے بعض رکن ممالک انہیں آزاد و خود مختار ریاستوں کے طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ گویا اقوامِ متحدہ کی رکنیت دنیا کے سیاسی نقشے کی مکمل تصویر نہیں بلکہ اس کا ایک مخصوص سفارتی ورژن ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں جنگ‘ بمباری‘ فوجی کشیدگی یا جنگ کے بعد کی تباہی کی خبر عوام تک نہ پہنچی ہو۔ تاریخ کی کتابوں میں پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے واقعات پڑھ کر لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کا ذکر آتا تو انسان سوچتا تھا کہ اس سے بڑھ کر تباہی بھلا کیا ہو سکتی ہے‘ لیکن گزشتہ ربع صدی کے واقعات دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تباہی کی ہماری تعریف ہی بدل گئی ہے۔

غزہ‘ افغانستان‘ عراق‘ شام‘ فلسطین‘ یمن‘ لیبیا‘ سوڈان‘ یوکرین‘ کانگو‘ میانمار اور دوسرے خطوں میں ہونے والی جنگوں نے انسانیت کو بار بار یہ یاد دلایا ہے کہ جنگ صرف سپاہیوں کو نہیں مارتی بلکہ نسلوں کو زخمی کر جاتی ہے‘ شہروں کو ویران کر جاتی ہے‘ معیشتوں کو تباہ کرتی ہے اور انسان کے اندر سے امن کا احساس تک نکال دیتی ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں دُنیا ایک ہی وقت میں کئی بڑے بحرانوں سے دوچار نظر آئی ہے۔ روس اور یوکرین کی جنگ اپنی جگہ موجود رہی۔ غزہ میں اسرائیلی کارروائیوں نے انسانی المیے کو جنم دیا۔ ایران اور اسرائیل و امریکہ کے درمیان براہِ راست عسکری کشیدگی نے پورے مشرقِ وسطیٰ کو خطرے میں ڈال دیا۔ سوڈان کی جنگ نے لاکھوں انسانوں کو بے گھر کیا۔ یمن‘ شام‘ لبنان‘ کانگو اور دیگر خطے بھی بدستور عدمِ استحکام کا شکار رہے۔

کسی ایک جنگ کی خبر کا ذکر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے دوسرے خطوں میں امن ہے۔ جس تنازعے کی تصویر ہمارے ٹی وی اسکرین پر نہیں آ رہی‘ ضروری نہیں کہ وہاں امن قائم ہو چکا ہو۔ کشمیر کے دونوں حصوں کی صورت حال ہو یا سوڈان کا بحران‘ دنیا کے کئی ایسے خطے ہیں جہاں خاموشی کو امن سمجھ لینا حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ: کیا تیسری عالمی جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی یا ہم اس کے مختلف ابواب پڑھ رہے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں اگر دنیا کے مختلف خطوں میں جنگیں جاری ہوں‘ بڑی طاقتیں ان جنگوں میں براہِ راست یا بالواسطہ شریک ہوں‘ عالمی تجارت اور توانائی کی ترسیل متاثر ہو‘ سمندری راستے غیر محفوظ ہو جائیں اور ایٹمی طاقتیں ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے لگیں تو اِسے ’’عالمی جنگ‘‘ کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ حالیہ ایران امریکا و اسرائیل کشیدگی نے اس خطرے کو مزید نمایاں کیا۔ آج کسی ایک ملک میں شروع ہونے والی جنگ چند گھنٹوں میں پورے خطے کے امن کو متاثر کر سکتی ہے۔

دنیا نے اقوام متحدہ کا ادارہ (بظاہر) اس لیے قائم کیا تھا کہ کوئی ملک دوسرے ملک پر حملہ کرے تو عالمی برادری اُس کے خلاف اجتماعی طور پر کھڑی ہو۔ جب عالمی ادارے کے فیصلے ہی بڑی طاقتوں کے سیاسی مفادات کے تابع دکھائی دینے لگیں اور سلامتی کونسل میں ویٹو کا اختیار رکھنے والی طاقتیں کسی بھی قرارداد کو اپنے مفاد کے خلاف ہونے پر روک سکیں تو چھوٹی اور درمیانی طاقتوں کے لیے اپنے دفاع کے نئے راستے تلاش کرنا فطری امر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے مختلف حصوں میں علاقائی دفاعی اتحاد اور باہمی سلامتی کے معاہدے وجود میں آ رہے ہیں۔ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ کو بھی اِسی بدلتی ہوئی عالمی صورتِ حال میں دیکھا جانا چاہیے۔

سعودی عرب پر حوثی حملوں کے حالیہ واقعات نے مکہ معاہدے کے حوالے سے بنیادی سوال سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ: اجتماعی دفاع کی شق عملی صورت میں کس طرح نافذ ہو گی؟ ہماری وزارتِ خارجہ نے واضح کیا ہے کہ پاکستان سعودی عرب کی خود مختاری‘ علاقائی سالمیت اور سلامتی کی حمایت جاری رکھے گا۔ حوثیوں کی جانب سے سعودی عرب کے خلاف حملوں میں اضافے کے باوجود امریکا نے براہِ راست فوجی مداخلت سے گریز کیا تو یہ بنیادی حقیقت سامنے آئی

کہ بین الاقوامی سیاست میں ہر طاقت سب سے پہلے اپنے مفادات دیکھتی ہے۔تو پھر مسلم ممالک اپنے اجتماعی مفادات کے بارے میں کب سوچیں گے؟

قرآن مجید نے مسلمانوں کو واضح طور پر باہمی نزاع سے بچنے کی ہدایت فرمائی: ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (الانفال:۴۶)۔ ''اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

یہ صرف روحانی یا اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کا ایک اٹل اصول بھی ہے۔ جو قومیں آپس میں تقسیم ہو جاتی ہیں' ان کی قوت ضائع ہو جاتی ہے؛ اور جو قوت باہمی نزاع میں صرف ہو جائے' وہ بیرونی خطرات کے مقابلے میں باقی نہیں رہتی۔آج مسلم دنیا کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ اُس کے خلاف کون سازش کر رہا ہے بلکہ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ مسلم دنیا خود اپنے اجتماعی مفادات کا تعین کیوں نہیں کر پا رہی! کیوں ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک کے خلاف کسی غیر مسلم طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے؟ کیوں ہماری دفاعی' معاشی اور سفارتی ترجیحات الگ الگ سمتوں میں بکھری ہوئی ہیں؟ کیوں ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی ایک مسلم ملک کو کمزور کرنا بالآخر پوری اُمت کی اجتماعی قوت کو کمزور کرتا ہے؟

آج دنیا کے متعدد تنازعات ہمیں یہی سبق دے رہے ہیں کہ جنگ کسی مسئلے کا مستقل حل نہیں۔ جنگ عموماً ایک مسئلے کو دوسرے دس مسائل میں تقسیم کر دیتی ہے۔ایک جنگ ختم ہوتی ہے تو اس کے ملبے سے اگلی جنگ کے اسباب جنم لے لیتے ہیں۔اس لیے آج مسلم دنیا کو جذباتی نعروں سے آگے بڑھ کر ایک جامع اجتماعی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ہمیں نہ کسی عالمی طاقت کا مہرہ بننا چاہیے' نہ کسی دوسری طاقت کے خلاف کسی تیسری طاقت کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہونا چاہیے۔ ہماری ترجیح ہونی چاہیے کہ مسلم ممالک اپنے باہمی اختلافات کو گفت وشنید سے حل کریں' ایک دوسرے کی خودمختاری کا احترام کریں اور اجتماعی دفاع کو کسی مخصوص ملک کے خلاف نہیں بلکہ اُمّت کے امن واستحکام کے لیے استعمال کریں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اقوام متحدہ کی تاریخ ہمیں ایک آخری سبق بھی دیتی ہے۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز قائم ہوئی' مگر وہ دوسری جنگِ عظیم کو نہ روک سکی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوام متحدہ قائم ہوئی' مگر آج دنیا پھر متعدد جنگوں کے بیچ کھڑی ہے۔ (باقی صفحہ 61 پر)

حقیقتِ نفاق

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۸ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۹ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۱۰ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۱۱ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۱۲ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۱۳﴾ (البقرۃ)

﴿اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ ۘ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ ؕ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۱ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۲ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ ۳ وَاِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُھُمْ ؕ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِھِمْ ؕ کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ؕ یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْھِمْ ؕ ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ ؕ قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ ۫ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ۴﴾ (المنافقون)

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا ۱۴۵﴾ (النساء) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ○ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ○ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ، وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ—— اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ، وَ أَعْمَالَنَا مِنَ الرِّيَاءِ، وَ أَلْسِنَتَنَا مِنَ الْكَذِبِ، وَ أَعْيُنَنَا مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ

آج کا موضوع نسبتاً مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کیونکہ نفاق کے روگ اور بیماری کے انجام کے بارے میں سورۃ النساء کی آیت ۱۴۵ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ ”منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔“ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو کفر کے مقابلہ میں نفاق سے کہیں زیادہ نفرت ہے۔ کافر تو کھلم کھلا منکر ہوتا ہے‘ وہ اسلام کا دعویٰ نہیں کرتا جبکہ منافق دوہرا مجرم ہے۔ اس کا کردار آستین کے سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ وہ اسلام کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن اسلام ہی کے خلاف سازشیں بھی کر رہا ہوتا ہے۔

ہر مسلمان اپنے لیے رسول اکرم ﷺ کی شفاعت کو آخری سہارا سمجھتا ہے کہ اگر حضور ﷺ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا فرما دیں‘ ہماری خطاؤں کی معافی کے لیے سفارش کر دیں تو اُمید ہوتی ہے کہ یہ ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے‘ لیکن سورۃ التوبہ کی آیت ۸۰ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے یہ امید بھی ختم کر دی۔ فرمایا گیا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ﴾

”(اے نبی ﷺ!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے پھر بھی اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔“

قرآن مجید کے ان الفاظ میں انتہائی سختی سے منافقین کی مغفرت کی تردید کر دی گئی۔ چونکہ آپ ﷺ سراپا رحمت وشفقت تھے: رحمت‘ مودت‘ نرمی آپؐ کی طبیعت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے آپؐ کو مخاطب کر کے قرآن پاک میں دو مقامات

پر یہ بھی کہا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ⑨﴾ (التحریم)

''اے نبی (ﷺ!) آپ کفار اور منافقین سے جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔ان کا ٹھکانا جہنم ہے' اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''

رسول اکرم ﷺ نے اپنے اس مزاج کی وجہ سے سورۃ التوبہ کی آیت نازل ہونے پر فرمایا تھا کہ اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ ان کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں ۷۰ مرتبہ سے زیادہ استغفار کر لیتا۔ اس پر سورۃ التوبۃ کی آیات ۸۴ و مابعد نازل ہوئیں:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑧④﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) ان میں سے کوئی مر جائے تو اُس کی نمازِ جنازہ کبھی ادا نہ کریں اور اُس کی قبر پر بھی کھڑے نہ ہوں۔ یقیناً انہوں نے کفر کیا ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ اور وہ مرے ہیں اسی حال میں کہ وہ نافرمان تھے۔''

لہٰذا اِن دو باتوں یعنی منافقین کا ٹھکانا جہنم کا سب سے نچلا گڑھا ہوگا اور منافقین کی مغفرت کسی شکل میں نہیں ہو سکتی' سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نفاق کا مرض نہایت خوف کے لائق ہے اور ہمیں اس سے بچنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔

نفاق کا اندیشہ کس کو؟

اس ضمن میں ہم مسلمان ایک مغالطے کا شکار ہیں اور وہ یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ منافق کوئی علیحدہ جنس ہے' ہم تو منافق ہو ہی نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے جب ہم قرآن حکیم میں نفاق اور منافقین سے متعلق آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو سرسری طور پر پڑھ کر گزر جاتے ہیں' ہمارے دل لرزتے نہیں۔ ہم سوچتے ہی نہیں کہ ان آیات میں ہمارا کوئی ذکر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی سوچ کی وجہ سے ہم اپنا محاسبہ نہیں کرتے اور ان آیات کی تاثیر سے محروم رہتے ہیں۔ نہ آنکھیں نم ہوتی ہیں اور نہ ہی دِل نرم پڑتے ہیں' جب کہ ان ہی آیات کو جب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پڑھتے تھے تو کانپ جاتے تھے۔ ہمیں ان آیات کو پڑھ کر کچھ ہوتا ہی نہیں‘ کیونکہ ہم نے اپنے ذہن میں اس بات کو بٹھا لیا ہے کہ ہم تو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت میں سے ہیں اور بخشے بخشائے ہیں۔ ہمارے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس طرزِ عمل کی برعکس کیفیت کو سمجھنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو واقعات پر غور کرتے ہیں:

i) حضرت حنظلہ (بن ربیع) اسیدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور دریافت کیا: ”حنظلہ! آپ کیسے ہیں؟“ میں نے کہا: ”حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔“ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے) کہا: ”سبحان اللہ! تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے کہا: ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ آپؐ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں‘ حتیٰ کہ ایسا لگتا ہے گویا ہم انہیں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں سے نکلتے ہیں تو بیویوں‘ بچوں اور کھیتی باڑی (اور دوسرے کام کاج) کو سنبھالنے میں لگ جاتے ہیں اور بہت سی چیزیں بھول بھلا جاتے ہیں۔“ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! یہی کچھ ہمیں بھی پیش آتا ہے۔“ پھر میں اور حضرت ابوبکرؓ چل پڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”وہ کیا معاملہ ہے؟“ میں نے عرض کی: ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم آپؐ کے پاس حاضر ہوتے ہیں‘ آپؐ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں‘ تو حالت یہ ہوتی ہے گویا ہم (جنت اور دوزخ کو) اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں‘ اور جب ہم آپؐ کے ہاں سے باہر نکلتے ہیں تو بیویوں‘ بچوں اور کام کاج کی دیکھ بھال میں لگ جاتے ہیں‘ ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔“ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنْ لَوْ تَدُومُونَ عَلٰى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي، وَ فِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَ فِي طُرُقِكُمْ، وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَ سَاعَةً)) [صحيح مسلم، كتاب التوبة، حديث:٦٩٦٦]

”اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ہمیشہ اسی کیفیت میں

رہو جس طرح میرے پاس ہوتے اور ذکر میں لگے رہو تو تمہارے بچھونوں پر اور تمہارے راستوں میں فرشتے (آکر) تمہارے ساتھ مصافحے کریں‘ لیکن اے حنظلہ! کوئی گھڑی کسی طرح ہوتی ہے اور کوئی گھڑی کسی (اور) طرح۔‘‘

یعنی رسول اللہ ﷺ نے حضرت حنظلہ ؓ کو اطمینان دلایا کہ یہ نفاق نہیں ہے۔ باقی تمہاری ایمان اور یقین کی جو کیفیت میری صحبت میں ہوتی ہے‘ اگر وہ دائم ہو جائے تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں میں اور راستوں میں مصافحہ کرنے لگیں۔ یہ کیفیت تو کبھی کبھی ہی میسر آسکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ؓ کبھی بھی اپنے آپ کو نفاق سے بالکل محفوظ نہیں سمجھتے تھے‘ بلکہ اس معاملہ میں اس قدر حساس تھے کہ ہمہ وقت اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

ii) غزوۂ تبوک سے واپسی پر جب مسلمانوں کا لشکر اندھیری رات میں ایک تنگ گھاٹی پر سے گزرا تو وہاں مدینہ کے کچھ منافقین رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کرنے کے لیے چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ اس تنگ جگہ سے گزرے تو انہوں نے حملہ کر دیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ جو صحابہ ؓ تھے‘ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمت دی اور انہوں نے اپنی لاٹھیوں کو منافقین کے اونٹوں کے منہ پر ایسے مارا کہ وہ پلٹ کر واپس بھاگ گئے۔ اگرچہ ان منافقین نے منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے لیکن آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان ؓ کو ان کے نام بتا دیے کہ یہ فلاں فلاں افراد تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ ؓ کو اپنا رازدار بنانے کا شرف بخشا تھا اور آنے والے فتنوں سے متعلق‘ اور تمام منافقین کے ناموں اور ان کے احوال سے متعلق پوری تفصیل سے ان کو آگاہ فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ ؓ کا نام صَاحِبُ سِرِّ النَّبِی ﷺ (نبی ﷺ کے رازدان) مشہور ہو گیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر ؓ نے حضرت حذیفہ ؓ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھا تھا کہ مجھے صرف یہ بتا دو کہ کہیں میرا نام تو منافقین میں نہیں ہے!

ان واقعات کو سننے کے بعد ہم اپنے بارے میں غور کریں تو یہ واضح ہوگا کہ ہمارے سوچنے اور صحابہ کرام ؓ کے سوچنے کا انداز بالکل برعکس ہے۔ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو نفاق سے محفوظ نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے اور مسنون دعا کرتے تھے:

((اللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ، وَ عَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ، وَ لِسَانِي مِنَ الْكَذِبِ، وَ عَيْنِي مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُورُ)) [مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات،ح:۲۵۰۱]

''اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے‘ میرے عمل کو ریا سے‘ میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھوں کو خیانت سے پاک کر دے‘ کیونکہ تُو خیانت کرنے والی آنکھوں کو جانتا ہے اور جو کچھ سینے (دل) چھپاتے ہیں (تُو اسے بھی جانتا ہے)۔''

یہ کیفیت ایک بندۂ مومن کی لازماً ہونی چاہیے‘ کیونکہ مومن ہمیشہ نفاق سے ڈرتا ہے جبکہ منافق ہمیشہ اپنے آپ کو نفاق سے محفوظ سمجھتا ہے۔ ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں: ''میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تیس صحابہؓ سے ملا ہوں‘ ان میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ اُس کا ایمان جبریل اور میکائیل کے ایمان کی طرح ہے۔'' مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ ''نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہو‘ اور اس سے خود کو محفوظ وہی سمجھتا ہے جو منافق ہو۔'' [صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب خوف المومن من ان یحبط عملہ] یعنی مومن کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں مجھ پر نفاق کا حملہ نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جس کے پاس دولت ہوتی ہے اسے ہی چوری کا ڈر ہوتا ہے‘ جس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو اُسے چوری کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح جس کے پاس ایمان کی دولت ہوگی‘ اُسے نفاق کا بھی خوف ہوتا ہے لیکن جس کے پاس ایمان ہی نہیں تو اسے نفاق کا کیا خوف ہوگا! گویا صرف صاحبِ ایمان کو اپنے بارے میں نفاق کا خوف ہوتا ہے جبکہ منافق اپنے آپ کو نفاق سے بالکل محفوظ سمجھتا ہے۔

الحمد للہ ہم منافق نہیں ہیں‘ لیکن ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارا نفاق سے کوئی تعلق نہیں اور ہم تو منافق ہو ہی نہیں سکتے۔ آج کی کیفیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ضرور ادا کریں لیکن یہ جان لیں کہ یہ بیماری کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں ہمیشہ اپنی دلی کیفیت اور طرزِ عمل کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے نفاق سے بچنے کی دعا کرتے

رہنا چاہیے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ نفاق دراصل کیا ہے! اس بیماری کی علامات کیا ہیں؟ اس کا آغاز کیسے ہوتا ہے؟

نفاق کی علامات

اس حوالہ سے دو احادیثِ مبارکہ پیش کی جا رہی ہیں:

- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) [صحیح البخاری:۳۳ وصحیح مسلم:۲۱۱]

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے۔ (۳) جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔''

یہ الفاظ بخاری و مسلم دونوں کے ہیں۔ آگے جو الفاظ ہیں' وہ مسلم شریف میں مزید اضافہ ہے: ((وَإِنْ صَامَ وَ صَلّٰى وَ زَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ)) ''خواہ ایسا شخص نماز پڑھتا ہو' روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔''

- دوسری حدیث بھی متفق علیہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَ مَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا، إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))

[صحیح البخاری:۳۴ وصحیح مسلم:۲۱۰]

''چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں یہ چاروں ہوں گی وہ تو خالص (کٹر) منافق ہوگا' اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی' یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے: (۱) جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے' خیانت کرے۔ (۲) جب بات کرے' جھوٹ بولے۔ (۳) جب وعدہ کرے'

خلاف ورزی کرے۔ (۴) جب کسی سے جھگڑ پڑے تو آپے سے باہر ہو جائے (یعنی اس کے جذبات بے قابو ہو جائیں اور وہ گالم گلوچ پر اتر آئے۔)''

یہ منافقین کی چار خصلتیں ہیں۔ اگر کسی میں چاروں ہوں تو وہ پکا منافق ہے' اگر ایک ہو تو اسی نسبت سے منافق ہوگا۔ اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں بتایا گیا ہے کہ چار صفات کی وجہ سے سو فیصد منافق ہوا اور ایک صفت کی وجہ سے پچیس فیصد۔ پس اسی طرح اگر دو صفات ہوں گی تو پچاس فیصد اور تین ہوں گی تو پچھتر فیصد منافق ہوا۔

نفاق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

نفاق (منافقت) کا لفظ نفق اور نافقاء سے بنا ہے۔ نفق کا مطلب سُرنگ ہے' یعنی زمین دوز راستہ جس کے دو منہ ہوتے ہیں۔ دوسرا عربی کا لفظ نافقاء ہے' جس کا مطلب گوہ کا بِل ہے۔ گوہ ایک جانور ہے جس کا عرب شکار کیا کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اندر اپنا گھر ایسے بناتا ہے کہ اس کے دو راستے ہوتے ہیں۔ اگر شکاری کتا ایک طرف سے آئے تو وہ دوسری طرف سے نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنا تحفظ کر لیتا ہے۔ یہ نفاق کی اصل حقیقت ہے جو ان دونوں الفاظ سے سامنے آ رہی ہے' یعنی دوغلا پن۔ کسی محفل میں جا کر ان کی خوشامد اور دوسروں کی مخالفت' اور دوسروں کی محفل میں جا کر ان کی خوشامد اور پہلوں کی مخالفت ظاہر کرنا۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴ میں اس کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا گیا:

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾﴾

''اور وہ جب بھی ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں' لیکن جب یہ تنہائی میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کی طرف تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تو آپ کے ساتھ ہیں' ہم تو بس مذاق کرنے والے ہی ہیں۔''

اس طرزِ عمل کی اصل وجہ اپنی حفاظت اور بچاؤ ہے۔ ایک رویّہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو نظریہ بھی قبول کیا تو اب ہر حال میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ دوسرا رویّہ یہ ہے کہ انسان ایک راستہ پر چلنا تو چاہے لیکن دامن بچا بچا کر کہ مجھے کوئی

نقصان نہ ہو۔ علامہ اقبال کا بہت پیارا شعر ہے: ؎

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

دینی تقاضوں کے سامنے آ جانے کے بعد بھی اگر انسان جان بچانے اور مال بچانے کا رویّہ اختیار کیے رہے تو یہ ایک خطرناک کیفیت ہے۔ حقیقی ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جان اور مال کھپایا جائے، لیکن انسان کو جان بھی پیاری اور مال بھی محبوب۔ انسان عموماً دین کے لیے جان، مال نہیں لگانا چاہتا۔ وہ جان کو مال کمانے کے لیے ہی خرچ کر رہا ہوتا ہے۔ مال کماتے کماتے اس کی کیفیت یہ ہوتی جاتی ہے:

﴿اَلۡهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝٢﴾

''تمہیں غافل کیے رکھا ہے بہتات کی طلب نے! یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔''

اگر اللہ کے دین کے لیے مال لگائے تو دنیاوی لحاظ سے مال بھی گیا، اور اگر جان لگائے تو اسی وقت کو مال حاصل کرنے کے لیے لگا سکتا تھا، لہٰذا یہ بھی دُنیاوی طور پر نقصان کی صورت ہے۔ سو نفاق کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اپنے مال اور اپنی جان کا تحفظ، اُسے بچا بچا کر رکھا جائے۔ یہی دراصل نفاق کی اصل جڑ اور رُوح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ اپنا مال اور جان اللہ کی راہ میں لگائے۔

نفاق کی اقسام

علماء کرام نے نفاق کی دو اقسام بتائی ہیں:

(۱) عقیدے کا نفاق (۲) عمل کا نفاق

نفاق کی بیماری کو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس طرح سمجھنا زیادہ آسان ہے:

(۱) ارادی نفاق/شعوری نفاق (جان بوجھ کر نفاق اختیار کرنا)

(۲) غیر ارادی نفاق/غیر شعوری نفاق (جس میں انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ نفاق کا آغاز ہو گیا)

(ا) ارادی/شعوری نفاق:

(*i*) مثال کے طور پر اگر کوئی یہودی جاسوس بن کر عرب میں آتا ہے۔ جیسے وہ یہودی جو رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کو نکالنے آئے تھے‘ وہ دراصل ارادی منافق تھے۔ وہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بظاہر اولیاء اللہ بنے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے خواب میں آئے اور کہا کہ دو کُتّے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ یہ خواب ان کو جب تین دن تک نظر آیا تو انہوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر تمام لوگوں کی کھانے کی دعوت کی۔ دعوت میں ہر آنے والے آدمی سے وہ خود ملے۔ ان کو خواب میں ان دو آدمیوں کی شکلیں دکھا دی گئی تھیں۔ جب مدینہ کے سب لوگ دعوت میں آ گئے تو پوچھا: ’’اب کوئی رہ تو نہیں گیا؟‘‘ اُن دونوں نے اپنی عبادت‘ زہد اور نیکی کا ایسا رُعب ڈالا ہوا تھا کہ نور الدین زنگیؒ کو بتایا گیا کہ دو اللہ والے ہیں جو بس عبادت میں مصروف رہتے ہیں‘ کہیں آتے جاتے نہیں۔ چنانچہ نور الدین زنگیؒ نے جا کر ان کے گھر کی تلاشی لی تو ان کے مصلیٰ کے نیچے سے اس سرنگ کا راستہ نظر آیا جس سے وہ نبی مکرم ﷺ کے روضۂ مبارک کی دیوار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اب یہ دیکھیں کہ ان کو کتنا وقت لگا ہوگا اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان رہ کر اس تاثر کو پیدا کرنے کے لیے کہ نہ صرف ان کو مسلمان سمجھا جا رہا تھا بلکہ ولی اللہ سمجھا گیا۔ چنانچہ یہ منافق بلکہ ارادی منافق تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ ہم تو ایک دن کے لیے بھی ایمان نہیں لائے بلکہ صرف مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے مسلمان ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ دراصل ایسے لوگ شعوری طور پر اسلام اور اہلِ ایمان کے دشمن ہوتے ہیں لیکن ظاہر میں قانونی طور پر مسلمان بنے ہوتے ہیں۔ یہ ارادی منافقت ہے۔

(*ii*) اسی طرح آج اگر ہندوستان کا کوئی ہندو یا سکھ جاسوس بن کر پاکستان آئے۔ بظاہر اس کا حُلیہ مسلمانوں جیسا ہو‘ نماز اور قرآن پڑھنے کا اہتمام کرتا ہو اور کسی سرحدی گاؤں کی مسجد میں مولوی بن کر بیٹھ جائے تو پہچاننا آسان نہیں ہوگا۔ بہر حال ایسا شخص بھی ارادی منافق کہلائے گا۔

(*iii*) اس کی ایک مثال کا ذکر قرآن حکیم میں بھی آیا جو کہ رسول اللہ ﷺ کے دور کی ہے۔ یہود اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ اسلام‘ حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی تو بڑی ساکھ بنتی جا رہی ہے‘ کیوں کہ جو ایک بار کلمہ پڑھ لے چاہے اس پر جتنا بھی تشدد کر لیا جائے‘ لیکن وہ واپس نہیں پلٹتا۔ اس ساکھ کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ صبح کے وقت یہ ظاہر کر دیا جائے کہ ہم ایمان لے آئے لیکن شام کو مُرتد ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس طرح لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اِن عالم لوگوں نے پورا دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گزارا تو وہاں پر کوئی خرابی دیکھی ہوگی تبھی تو اسلام لا کر بھی ہٹ گئے۔ عوام کے اندر شک کی کیفیت پیدا ہوگی اور اسلام کی یہ ساکھ ختم ہو جائے گی کہ جو ایک بار ایمان لے آئے وہ واپس نہیں پلٹتا۔ سورۂ آلِ عمران میں ان کی اس سازش کا ذکر اس طرح کیا گیا:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾

’’اور کہا (طے کیا) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کہ ایمان لاؤ اس کلام پر جو کہ نازل کیا گیا ہے ان لوگوں پر جو ایمان لائے ہیں دن کے ابتدائی حصہ میں اور اس کا انکار کر دو دن کے آخری حصہ میں‘ شاید کہ وہ بھی لوٹ جائیں۔‘‘

دیکھنے والوں کو تو وہ لوگ چند گھنٹوں کے لیے اہلِ ایمان نظر آئے لیکن انہوں نے تو ایمان کی لذت چکھی ہی نہیں۔ وہ تو کفر کی حالت میں آئے‘ کفر ہی میں رہے اور کفر ہی میں چلے گئے۔ ایک خاص وقت کے لیے قانوناً مسلمان تو تھے لیکن ان کو معلوم تھا کہ وہ مسلمان نہیں‘ محض فریب دینے کے لیے لبادہ اوڑھا تھا۔

چنانچہ یہ شعوری نفاق کی تین مثالیں سامنے آگئی ہیں۔ ایک حضور ﷺ کے زمانے کی‘ ایک نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کی اور ایک آج کے دور کی۔ بہرحال اس نفاق کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

(۲) غیر شعوری/غیر ارادی نفاق:

یہ وہ نفاق ہے جس کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے پتہ بھی نہ چلے اور میرے ایمان کی دولت پر پڑا کا پڑ جائے۔ لہٰذا ہمیں جس نفاق کو پہچاننا اور سمجھنا ہے وہ یہ غیر ارادی و غیر شعوری نفاق ہے۔ قرآن حکیم میں بھی اکثر و بیشتر اسی نفاق کا ذکر آیا ہے۔

نفاق کی اس قسم کو سمجھنے کے لیے اس پہلو پر غور کرنا ضروری ہے کہ تمام لوگ قوتِ ارادی کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے۔ جیسے کوئی جسمانی لحاظ سے قوی ہے کوئی کمزور‘ اسی طرح دماغی طور پر کوئی زیادہ ذہین اور کوئی کم ذہین ہوتا ہے۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دین اسلام ایک انقلابی دعوت ہے۔ دین کے تقاضوں پر شعوری طور پر عمل کرنے کے لیے مصائب اور مشکلات ضرور آتی ہیں۔ سود سمیت ہر حرام کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پھر دین کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسے پھیلایا جائے اور غالب کیا جائے۔ اس کے لیے اللہ کی راہ میں مال اور جان خرچ کرنے کا مطالبہ آتا ہے۔ چنانچہ کچھ تو قوی ہمت لوگ ہوتے ہیں جو اتنی مضبوط قوتِ ارادی کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ ہر حال میں دین کے احکامات پر مضبوطی سے ڈٹ جاتے ہیں۔ چاہے لوگ کچھ بھی کہیں‘ طنز کریں یا مذاق اڑائیں‘ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب فیصلہ کر لیا تو خواہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں یا شدید ایذائیں سہنا پڑیں‘ ہر چہ بادا باد! یہ مؤمن صادق کی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ شعوری فیصلہ کر لیتا ہے کہ:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

”بے شک میری نماز اور میری قربانی‘ میرا جینا اور میرا مرنا اُس اللہ کے لیے ہے جو کہ تمام جہانوں کا رب ہے۔“

مؤمن صادق کی یہی کیفیت سورۃ التوبہ میں بھی بیان کی گئی:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا

﴿بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾﴾

’’یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں بھی اور اُن کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں‘ پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمے ہے سچا‘ تورات‘ انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اپنی اِس بیع پر جس کا سودا تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔‘‘

اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ماننے والا ہے تو ایمان کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اللہ کا دین قائم کرنے کی جِدّ وجُہد کرے‘ چاہے کتنی ہی قربانیاں دینا پڑیں۔ ایسا فیصلہ کرنے والے لوگ ہی انقلاب برپا کر سکتے ہیں ورنہ اسلام کا نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ لاکھ ہم اسلام کو پسند کرلیں لیکن جب تک ’’ہر چہ بادا باد‘‘ کی شان کے ساتھ میدان میں نہیں اتریں گے‘ اُس وقت تک اسلام غالب نہیں ہوسکتا۔ ایسے مردانِ کار مطلوب ہیں کہ جو فیصلہ کیا‘ اس پر ڈٹ گئے۔ انسانوں میں کمزور ہمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی عادت کو چھوڑنا چاہیں لیکن چھوڑ نہیں پا رہے ہوتے‘ کسی کام کے کرنے کی خواہش وارادہ رکھتے ہیں لیکن عین وقت پر قوتِ ارادی ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور لاکھ خواہش کے باوجود وہ کام نہیں ہو پاتا۔ ایک شخص دیانت داری سے اسلام قبول کرتا ہے‘ اس کے تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا ہے کہ سچا مومن بن جائے لیکن ہوسکتا ہے کہ دین کے مشکل احکامات اُسے آزمائش لگ رہے ہوں۔ حقیقی مؤمن کی تعریف سورۃ الحجرات میں یوں بتائی گئی:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر پھر شک میں نہ پڑے‘ اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے۔ یہی ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

سو ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ ایمان والے اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال ضرور کھپاتے ہیں۔

ضعفِ ایمان یہ ہے کہ جب دین کے مشکل مطالبات سامنے آتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو یا انفاق کرو تو اُس وقت جان و مال زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایک گومگو کی حالت میں گرفتار ہو جاتا ہے' سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں! یہ تذبذب کی کیفیت ہے جس کو سورۃ النساء کی آیت ۱۴۳ میں یوں بیان کیا گیا:

﴿ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ ﴾

''نہ تو وہ اِن کی طرف ہیں نہ اُن کی طرف ہیں۔''

ایسی صورتِ حال میں ضعیف الایمان شخص تو اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے کہ اُس وقت قوتِ ارادی کمزور پڑ گئی تھی' ایمان پر نفس غالب ہو گیا تھا اور دین پر دنیا غالب آ گئی تھی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے اور آئندہ کے لیے دین کے تقاضے سامنے آنے پر ثابت قدم رہنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ جب تک اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا جائے' اپنی تقصیر پر معافی طلب کی جائے' اپنی کوتاہی کو مانا جائے تو یہ کیفیت ایمان کی کمزوری کہلائے گی۔ البتہ اگر ماننے کے بجائے جھوٹے بہانے بنانا شروع کر دیے تو یہاں سے نفاق کی سرحد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جس طرح TB کی بیماری کی تین stages ہوتی ہیں اور آخری مرحلہ پر آ کر یہ بیماری عموماً لاعلاج ہو جاتی ہے' بالکل یہی حال نفاق کی بیماری کا بھی ہے۔

نفاق کی پہلی سٹیج

کئی مرتبہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بعد آدمی کا نفس اُسے آمادہ کرتا ہے کہ کیوں اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے ذلیل کرواتے ہو۔ جھوٹ بول دو کہ میری تو پوری آمادگی تھی مگر عین وقت پر یہ عذر ہو گیا' یہ رکاوٹ آ گئی' یہ مجبوری تھی' فلاں بیماری ہو گئی۔ اس صورت میں عزّتِ نفس تو بچ جائے گی لیکن یہاں سے جھوٹ کا آغاز ہو گیا۔ گویا اب ضعفِ ایمان نہیں رہا بلکہ نفاق شروع ہو گیا ہے (جیسا کہ آغاز میں حدیثِ مبارک میں منافق کی پہلی نشانی جھوٹ ہی بتائی گئی تھی)۔

نفاق کی دوسری سٹیج

جب کئی مرتبہ کوئی نہ کوئی عذر پیش کیا جائے تو لوگوں کی نگاہوں میں اعتبار کم ہوتا جاتا

ہے۔ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ ان کے ساتھ ہی ہر دفعہ کوئی نہ کوئی عذر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب ایسا شخص جھوٹے بہانوں کے بجائے جھوٹی قسموں کا سہارا لیتا ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر لوگوں کو طرح طرح کے بہانے زوردار انداز میں پیش کرے گا۔ اب یہ مرض دوسری سٹیج میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں سٹیجوں میں ابھی شفا کا امکان ہے کہ انسان اگر چاہے تو اپنے رویّے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ سورۃ البقرہ کے دوسرے رکوع کے آغاز میں نفاق کا ذکر آیا ہے مگر کسی کا نام نہیں لیا گیا۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۱۰﴾

’’بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ دھوکا دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو‘ اور وہ دھوکا نہیں دیتے سوائے اپنی جانوں کو اور وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اس کی وجہ سے جو وہ جھوٹ بولتے تھے ان کے لیے دردناک عذاب سزا ہے۔‘‘

دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ اگر آپ ہدایت کی طرف آئیں گے تو اللہ آپ کی ہدایت میں اضافہ کرے گا۔ ایک نیکی کریں گے‘ دس نیکیوں کی مزید توفیق ملے گی لیکن اگر غلط راستے کی طرف جائیں گے تو اللہ آپ کے لیے اُس راستے کو بھی کھول دے گا۔ ایک بُرا کام کریں گے‘ دس برائیوں کا راستہ مزید کھلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا راستہ اختیار کریں گے تو وہ آپ کے لیے اس راستے کو کھول دے گا۔ یہ ہے وہ مرض جو ان کے دلوں میں ہے۔ اللہ نے یہ روگ بڑھا دیا ہے۔ اس طرح نفاق کی اہم ترین علامت جھوٹ کو اِن آیات میں واضح کیا گیا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں منافق کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ صرف علامات واضح کرتے

ہوئے خبردار کیا جا رہا ہے کہ اپنا محاسبہ کرلو۔ اگر تمہارے اندر یہ علامات موجود ہیں تو اپنی اصلاح کرلو۔ سورۃ البقرۃ کے بعد سورۃ المنافقون نازل ہوئی ہے تو اس کے آغاز میں باقاعدہ منافقین کا لفظ آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾

''(اے نبی ﷺ!) جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔''

گواہی اور قسم دراصل ایک ہی چیز ہے۔ منافقین کے اس بیان پر اللہ تعالیٰ نے زبردست تبصرہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾

''ہاں اللہ جانتا ہے کہ آپ یقیناً اس کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔''

دراصل ان منافقوں کا قول تو سچا تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سچ بول رہے ہیں مگر اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں کیونکہ صرف زبان سے یہ اقرار کر رہے ہیں' ان کے دل اور عمل اس کی گواہی نہیں دیتے۔ گویا ان کی بات جھوٹ نہیں ہے' سچ ہے لیکن بولنے والا جھوٹا ہے۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ لوگ اللہ کے راستے سے خود رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اُحد میں کیوں نہیں پہنچے' اپنی ذمہ داری کیوں نہیں پوری کی تو پہلے تو باتیں بناتے ہیں اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ مان نہیں رہے تو فوراً اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب کوئی شریف آدمی کیسے جھٹلا سکے گا جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ تو اشرف الناس ہیں' سو آپؐ خاموشی اختیار کر لیتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ ان کو جانتے نہیں تھے' آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں مگر آپؐ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی شرافت و نرمی تھی۔ چنانچہ ان منافقین نے اللہ کے راستے سے رُکنے کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا تھا۔

(جاری ہے)

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۱۲)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سورۃ البقرہ کا زیر مطالعہ یہ چوتھا رکوع اپنے مضامین کے اعتبار سے جس قدر اہم ہے‘ اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ یہ واقعتاً قرآن حکیم کا مشکل ترین مقام ہے۔ فلسفے کے اہم مسائل اپنی جگہ پر مشکل ہیں‘ اور جن بنیادی حقیقتوں پر اُن کا دارومدار ہے اُن کا ادراک و شعور بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ اِس درسِ قرآن کے دورِ ثانی کے آغاز کے وقت دو نکات مسلسل پیش نظر رہنے چاہئیں۔

ایک یہ کہ قرآن مجید کی تفہیم‘ تشریح‘ تفسیر یا تاویل کے ضمن میں میرا اپنا ایک ذوق ہے‘ جو دلیل اور برہان پر قائم ہے۔ وہ یہ ہے کہ جہاں تک قرآن حکیم کا وہ حصہ ہے جو اعمال سے بحث کرتا ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے‘ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے‘ اوامر کیا ہیں اور نواہی کیا ہیں‘ یعنی قرآن حکیم کی عملی تعلیمات‘ تو اس کے بارے میں ہمارا رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم پیچھے سے پیچھے کی طرف جائیں۔ اَسلاف کی آراء کو دیکھیں‘ بلکہ انتہائی پیچھے پہنچ کر صاحبِ قرآن ﷺ تک پہنچ جائیں۔ اس لیے کہ اس کے ضمن میں اصل دلیل نبی اکرم ﷺ کی تعبیرات اور آپؐ کی عملی تشریح ہے۔ یعنی جس طرح آپ ﷺ نے قرآن مجید کے احکامات پر عمل کر کے دکھایا‘ وہ اصل سند اور اصل دلیل ہے۔ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی‘ تمام بولہبی است

گویا دین تو نام ہی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے‘ اور بالخصوص جو اس کا عملی حصہ ہے اس کے ضمن میں تو اوّلین سند بھی حضور ﷺ کا قول و عمل اور آخری سند بھی آپ ﷺ کی

سُنّت ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار واقوال اور اُن کا طرزِ عمل ہے۔ پھر درجہ بدرجہ تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور ہمارے ائمہ فقہ کے اقوال و آراء ہیں۔ ائمہ فقہاء نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول تمام روایات' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت' نیز آثارِ صحابہؓ سب کا جائزہ لے کر جو آراء مرتّب کی ہیں انہوں نے مستقل مکاتب فقہ کی صورت اختیار کر لی۔ درجہ بدرجہ یہ سب چیزیں آئیں گی۔ چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی عملی تعلیمات کے لیے اسلاف کی طرف رجوع کریں' یہاں تک کہ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں پہنچا دیں۔

البتہ جہاں تک اُن مسائل کا تعلق ہے جو خالصتاً علمی ہیں' بالخصوص جن سے سائنس کے شعبے بھی بحث کرتے ہیں' اس کائنات کے وہ حقائق کہ جن کے ضمن میں انسانی علم نے ارتقاء کیا ہے' انسان نے بہت سی معلومات حاصل کی ہیں' سائنس کے ذریعہ انکشافات و اکتشافات ہوئے ہیں' پھر ایسے حقائق بھی ہیں جن کی تصدیق ہو چکی ہے اور ان کو انسان نے ٹیکنالوجی کی بنیاد بنایا ہے' اگر قرآن حکیم میں ان چیزوں کے حوالے ہیں تو ان کے ضمن میں آگے کی طرف چلنا ہوگا' اور جو سائنسی ترقی ہوئی ہے' انسانی علم میں جو ارتقاء ہوا ہے' اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے ان مقامات کو سمجھنا ہوگا۔ اس میں ہمارے لیے اسلاف کا قول سند نہیں ہے' اس لیے کہ ان کا تعلق اُس دور سے ہے جب انسان کا یہ علم ابتدائی مراحل میں تھا' ابھی معلومات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ انہوں نے اپنے دور کی معلوماتی اور علمی سطح کے مطابق تعبیر (interpretation) کی ہے' جس کی حیثیت ہمارے لیے ایک طرح سے reference کی تو ہو سکتی ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ اُن کی کیا آراء تھیں' لیکن وہ کسی دلیل یا سند کے درجے میں نہیں ہیں۔ یہ تو ایک بنیادی بات تھی جو تفصیلاً تعارفِ قرآن کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ عالَمِ غیب کے جو حقائق ہیں' بالخصوص عالَمِ آخرت اور عالَمِ برزخ وغیرہ سے متعلق جو بعض چیزیں یہاں زیرِ بحث آ رہی ہیں' ان کی صحیح صحیح تعبیرات کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں جو متشابہات کا دائرہ ہے اس

ضمن میں اجمال پر اکتفا کرنا چاہیے اور جو نتیجہ نکلتا ہے وہ حاصل کر لینا چاہیے۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے جو سورۂ آلِ عمران کے آغاز میں بیان کیا گیا:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُ ۗ وَٱلرَّٰسِخُونَ فِى ٱلْعِلْمِ يَقُولُونَ ءَامَنَّا بِهِۦ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ﴾ (آیت ۷)

’’اوران کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس (کتاب) پر‘ یہ کُل کا کُل ہمارے ربّ کی طرف سے ہے۔‘‘

جن کو رسوخ فی العلم حاصل ہو جاتا ہے‘ قرآن مجید میں اُن کے اصل اعتناء و دلچسپی کا معاملہ محکمات کے ساتھ ہوتا ہے۔ متشابہات کی اصل تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔ متشابہات کے ذیل کی بھی بہت سی چیزیں اس رکوع میں آ رہی ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان دونوں چیزوں کو ذہن میں رکھیے۔ اس سلسلۂ درس کی گزشتہ نشستوں میں تخلیق کے تین مدارج (level) بیان کیے گئے تھے۔ ایک ہے عالَمِ اَمر میں نور کا ابتدائی دور‘ جس میں ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کی تخلیق ہوئی۔ اس کے بعد جو دو stages ہیں یہ تنزلات ہیں۔ پھر نار کا دور ہے۔ بڑے بڑے ناری کُرّے وجود میں آئے ہیں اور بڑا دھماکا (Big Bang) ہوا ہے۔ عالَمِ اَمر کے پہلے مرحلہ تک ہماری رسائی قطعاً ممکن نہیں ہے۔ سائنس کبھی بھی اُس کے بارے میں نہیں جان سکے گی‘ اس لیے کہ وہ اُس کے دائرے سے خارج ہے۔ بہرحال جب یہ کُرّۂ زمین ٹھنڈا ہوا اور اس پر crust وجود میں آیا تو یہاں حیوانات کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا‘ جن میں چوٹی پر Homo sapiens ہیں۔ اس کے ضمن میں صرف ایک وضاحت کرنی ہے کہ ’’نور‘‘ کا جو لفظ استعمال کیا جا رہا ہے کہ ملائکہ نوری الاصل ہیں یا ان کی تخلیق نور سے ہوئی ہے‘ اُس نور کو اِس نور پر قیاس مت کیجیے جو ہمارے ہاں light کا مترادف ہے۔ یہ ’’لائٹ‘‘ فزکس کا ایک موضوع ہے۔ اگرچہ ہم اس پر نور کا اطلاق کر رہے ہیں‘ لیکن وہ نور جو عالَمِ امر کا ہے اُس کے اور اِس کے مابین نوعیت کا فرق ہے۔ یہ لائٹ عالَمِ مادّی کی شے ہے‘ جو

ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار (velocity) سے حرکت کرتی ہے۔ عالَمِ مادّی میں ہمیں اس رفتار سے زیادہ کا علم نہیں ہے' لیکن پھر بھی اس میں وقت کا معاملہ (time element) ہے۔ پھر اس نور کے ساتھ نار یعنی حرارت گویا ملی جلی ہوئی ہے۔ یہ نور (light) سورج سے آرہا ہے جو ناری کرہ ہے' جس کا ٹمپریچر انتہائی زیادہ ہے۔ چنانچہ یہ نور اور نار باہم ملے ہوئے ہیں۔ یہ روشنی مادّی نور ہے جس کا ہم فزکس میں مطالعہ کرتے ہیں جبکہ عالَمِ امر کا نور ایک مختلف شے تھا۔ وہ ایک ''خنک نور'' تھا۔ وہ کوئی ٹھنڈی روشنی تھی جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اُس کی اصل حقیقت کیا تھی۔ وہ نور اصل مادّۂ تخلیق ہے ملائکہ کا بھی اور ارواحِ انسانیہ کا بھی۔ یہ نور جس سے ہم واقف ہیں' یہ بگ بینگ کے بعد وجود میں آیا ہے اور بہت چھوٹے چھوٹے ذرات (پروٹانز) پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے ایک رفتار ہے اور اس کے ساتھ وقت کا معاملہ منسلک ہے' جبکہ عالَمِ امر ان معاملات سے ماوراء ہے۔ وہاں تو کُنۡ فَیَکُوۡن والی بات ہے' جبکہ عالَمِ خلق میں جو بھی چیز ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس میں time element لازمی ہے۔ آسمان اور زمین کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی ہے (یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس سے کوئی چوبیس گھنٹے والا دن مراد نہیں ہے)۔ اسی طرح رحم مادر میں بچہ پرورش پاتا ہے تو اُسے وجود میں آنے میں نو مہینے لگتے ہیں۔ بہر حال time element عالَمِ خلق کا ایک لازمی عنصر ہے جبکہ عالَمِ اَمر اس سے ماوراء ہے۔

ایک اشتباہ کا ازالہ

آیت ۳۰ میں ہم نے پڑھا کہ فرشتوں نے یہ بات کہی کہ: پروردگار! آپ زمین میں ایسا خلیفہ بنائیں گے جو وہاں فساد اور خوں ریزی کرے گا؟ جبکہ ہم آپ کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت سرگرم ہیں' آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں' آپ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ آپ نے ہمیں اس خدمت پر مامور کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اشتباہ سا ہوتا ہے کہ یہ گویا فرشتوں کی طرف سے اعتراض کی کوئی شکل ہے۔ ہمارے مفسّرین کا ذہن یہ بات قبول نہیں کرتا کہ فرشتوں کا جو مقامِ عبدیت ہے' انہیں جو قرب ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے اس اعتبار سے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے زبانِ اعتراض بھی کھول سکتے

ہیں۔ چنانچہ اس کی جو مختلف انداز سے تعبیرات کی گئی ہیں‘ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ ایک استفہام تھا‘ سمجھنے کی کوشش تھی۔ جیسے سورۃ البقرہ ہی میں آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ﴾ ’’پروردگار! مجھے مشاہدہ کرادے کہ تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟‘‘ اس پر فوری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوچھا گیا: ﴿اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ﴾ ’’کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟‘‘ کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ﴾ ’’کیوں نہیں! لیکن مَیں ذرا اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔‘‘ میرا اس پر ایمان ہے اور مَیں اس کی تصدیق کرتا ہوں‘ لیکن اپنے ایمان ویقین میں مزید پختگی چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرا یقین آخری درجے تک پہنچ جائے۔ اسی درجے میں یہ بات سمجھیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں سے بھی کہا جاتا کہ کیا تمہیں اعتماد نہیں ہے‘ تمہیں یقین نہیں ہے کہ جو کام مَیں کرنے چلا ہوں وہی درست ہے‘ تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ ہم چاہ رہے تھے کہ ہمیں اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے! تو یہ استفہام ہے۔

اس ضمن میں مولانا اصلاحی صاحب نے بہت عمدہ تعبیر کی ہے کہ: ’’(فرشتوں کا) اصل مقصود اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی حکمت و مصلحت معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے ایک طرف تو اس اندیشہ کو ظاہر کر دیا جو انسان کی خلافت کے اندر ان کو نظر آیا۔ دوسری طرف اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق سے مقصود محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا‘ اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔‘‘

تاویلِ خاص کے اعتبار سے غور کریں تو سورۃ البقرہ کے اس مضمون کے بعد ہم اس مضمون کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں جہاں یہود سے براہِ راست خطاب شروع ہو جائے گا۔ ان کا باہم ربط یہ ہے کہ دراصل اس سرگزشت میں ایک آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ دعوتِ حق کے معاملے میں ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اشتباہ لاحق ہو جائے‘ کہیں کوئی اشکال ہو‘ بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو‘ اس کی وجہ سے اس دعوت کو قبول کرنے میں تاخیر ہو جائے۔ اس صورت میں غالب امکان ہے کہ شبہ واقع ہوا ہے تو یہ رفع بھی ہو جائے گا‘ اشکال ہے تو اس

کا ازالہ ہو جائے گا۔ ایسے لوگ جن پر حقیقت منکشف ہو جائے گی وہ بات کو تسلیم کر لیں گے۔ البتہ اس کے برعکس تکبّر اور حسد کی بنیاد پر جو انکار ہوتا ہے وہ مستقل اور دائمی ہوتا ہے' وہ رفع ہونے والا نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرشتوں کو جو اشکال پیش آیا یا جو اشتباہ ہوا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی وضاحت ہوگئی اور انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ یہ گویا طرزِ عمل تھا اُن لوگوں کا کہ جنہیں حضور ﷺ کی بات کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ کچھ اشکالات' کچھ شبہات تو ہوئے' لیکن جیسے جیسے وہ شبہات رفع ہوتے گئے' اشکالات دور ہوتے گئے وہ ایمان لاتے چلے گئے۔ اس کے برعکس علماء یہود کا طرزِ عمل تکبّر اور حسد کی بنیاد پر تھا کہ ہم بنی اسماعیل کی نسبت بلند مرتبہ کی حامل قوم ہیں' اعلیٰ نسل سے ہیں' chozen people of the Lord ہیں۔ ابھی تک ہماری یہ امتیازی شان رہی ہے کہ نبوت اور رسالت ہم میں رہی ہے' کتابوں کا نزول ہم سے متعلق رہا ہے۔ آج اگر یہ نعمت ہم سے سلب کر کے ان کو دی جا رہی ہے تو ہم اس کی بھرپور مخالفت کریں گے' حالانکہ وہ پہچان گئے تھے کہ محمد عربی ﷺ آخری نبی ہیں۔ قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ﴾ کہ یہ حضرت محمد ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ حسد اور تکبر کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ سوتے کو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہے۔ جنہیں اشتباہ ہوا وہ سوئے ہوئے تھے' آپ ﷺ نے جگا دیا تو جاگ گئے۔ البتہ جو جاگے ہوئے ہیں' پہچانے ہوئے ہیں' ان کے انکار کا سبب تکبّر اور حسد ہے' تو ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ سرگزشت آدمؑ و ابلیس کی تفصیل جو یہاں آ رہی ہے یہ ایک طرح سے تمہید باندھی جا رہی ہے' علمائے یہود کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ تمہارا طرزِ عمل ابلیس سے مشابہ ہے۔ جس بنیاد پر اُس نے استکبار کیا اور کفر کی روش اختیار کی' اللہ کی نافرمانی کی اور راندۂ درگاہ ہو گیا' بعینہٖ وہی روش تم اختیار کر رہے ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ فرشتوں کے دل میں خلافت کی خواہش پیدا ہوئی تھی' تو اس کی ایک تاویل یہ ہو جائے گی کہ ایک وسوسہ تھا جو اُن کے ذہن میں آیا۔ ہمارے ہاں اُصول

یہی ہے کہ وسوسہ جب تک وسوسہ کے درجے میں رہے اور اُس پر انسان عمل نہ کرے تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کو احساس ہوا ہو کہ ہم اس کے زیادہ اہل ہیں۔ خلافت کا یہ منصب حضرت آدمؑ یا ذُرّیتِ آدم کو دیا جا رہا ہے تو ہمارے اندر اس کی اہلیت کے سارے تقاضے پورے ہیں' لیکن جب اُن کے سامنے بات واضح ہوگئی اور انہوں نے تسلیم کرلیا تو اس ضمن میں اُن پر کوئی ملامت کا پہلو نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک استفہام اور اشکال کو رفع کرنے کی صورت ہے۔

آیت ۳۱ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۱﴾ ''اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام نام' پھر اُن (تمام اشیاء) کو پیش کیا فرشتوں کے سامنے اور فرمایا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچّے ہو۔''

صدق کا لفظ عربی زبان میں صرف سچ کے لیے نہیں آتا' بلکہ کسی شے کے درست ہونے کے لیے بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ اگر تمہارا خیال صحیح اور تمہارا موقف درست ہے تو ان اشیاء کے نام مجھے بتاؤ! اسی طرح کذب جھوٹ کے لیے بھی آتا ہے اور جب کوئی آدمی جان بوجھ کر خلافِ حقیقت بات کہہ رہا ہو یا بیان کر رہا ہو' اگر مغالطہ میں آکر بھی کوئی شخص خلافِ حقیقت بات کر رہا ہو' خلافِ واقعہ بات بیان کر رہا ہو' تو اُس پر بھی کذب کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صدق اور کذب کا اردو میں جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں' عربی میں اس سے وسیع تر ہے۔

آیت ۳۲ ﴿قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳۲﴾ ''انہوں نے کہا: (پروردگار!) نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے' ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اُس کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے کامل حکمت والے ہیں۔''

یہاں پر حصر کا اسلوب ہے: اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ یقیناً تُو ہی واحد ہستی ہے

کہ جو پورے علم کا احاطہ کرتی ہے‘ جس کے پاس کُل علم ہے‘ ہر شے جس کے علم میں ہے‘ اور واحد تیری ہی ذات ہے جو حکمت کا بھی احاطہ کرنے والی ہے۔

آیت ۳۳ ﴿قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اللہ نے فرمایا کہ اے آدم‘ ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام! تو جب اُس نے بتادیے ان کو اُن سب کے نام تو (اللہ نے) فرمایا: کیا مَیں نے تم سے کہا نہ تھا کہ مَیں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزوں کو اور مَیں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔‘‘

حضرت آدمؑ کی خلافتِ ارضی کی اساس

یہ چند آیات ہیں جن میں ایک ہی مضمون آیا ہے‘ بحیثیت مجموعی ہم اس پر کلام کریں گے۔ یہاں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ یہ نام کن چیزوں کے تھے؟ اصل میں یہ وہ انداز نہیں ہے کہ فرشتوں کا کوئی امتحان لیا گیا تھا‘ بلکہ فرشتوں کے سامنے ایک شے کی وضاحت پیش کی جارہی ہے کہ جس ہستی کو مَیں خلافت عطا فرما رہا ہوں اس میں جہاں شر کا پہلو ہے وہاں خیر کا پہلو بھی ہے۔ پھر یہ کہ جہاں مَیں اُس کو اختیار دے رہا ہوں وہاں ساتھ ہی علم بھی دے رہا ہوں‘ اور اس کے اندر جو بھی شر کا امکان ہے یہ علم اس کو متوازن (balance) کرے گا اور خلافت کی بنیاد بنے گا۔

یہاں اصل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کن کے نام سکھائے تھے؟ اس حوالے سے دو آراء ہیں۔ ہمارے اکثر و بیشتر مفسرین متقدمین و متاخرین کا تقریباً اس پر اجماع ہے کہ اس سے اشیاء کے صرف نام نہیں‘ بلکہ ان کے خواص اور خاصیتیں (properties) مراد ہیں‘ اس لیے کہ انسان مادّی علم اپنے حواس (sense organs) اور پھر عقل کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے۔ ہمارے حواس معلومات (sense data) فراہم کرتے ہیں۔ آنکھ نے کچھ دیکھا‘ کان نے کچھ سنا‘ زبان نے کچھ چکھا‘ ہاتھ

نے کچھ چھوا‘ ناک نے کچھ سونگھا۔ اس طرح ہمارے دماغ نے مختلف ذرائع سے کچھ معلومات حاصل کیں‘ پھر ان معلومات کو مرتّب کیا اور ان سے استنباط کیا۔ ان سے استدلال اور استخراج کرتے ہوئے انسان اپنے غور وفکر اور منطق کے ذریعے سے اُن بہت سی معلومات اور حقیقتوں تک پہنچ جاتا ہے جو غیر معلوم تھیں۔ یہ انسانی علم ہے‘ جس کو آج سائنسی یا مادّی علم کہا جاتا ہے۔ اسی میں فلسفیانہ علم کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اس پر وہ اپنے دماغ کی برتر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کے کچھ کُلّی حقائق کے بارے میں بھی رائے قائم کرتا ہے۔ تاہم ابھی ہم فلسفہ کی بات نہیں کر رہے۔ اس وقت بنیادی انسانی علم یعنی حواس کے ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر مزید استدلال اور استنباط سے کچھ اور چیزوں کو معلوم کرتے ہوئے آگے بڑھنا‘ یہ علم قدم بقدم ترقی کرتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی شاید اتفاقاً ہی ایسا ہوا ہوگا کہ دو پتھر آپس میں ٹکرائے ہوں اور ان سے چنگاری پیدا ہو گئی ہو۔ جس انسان نے پہلی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا تو اس کے سامنے بہت بڑا اکتشاف اور انکشاف ہوا ہوگا۔ اس کے بعد پتھروں کو ٹکرا کر چنگاری پیدا کر کے آگ کی دریافت ہو گئی تھی جو توانائی (energy) کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی۔ پہلے پہل یہی توانائی کا واحد ذریعہ ہوگی اور وہ شخص بہت بڑا موجد قرار پایا ہوگا جس نے آگ دریافت کی۔ اسی طرح یہ تو سب ہی دیکھتے رہے ہوں گے کہ درختوں کے پھل اوپر سے زمین پر گرتے ہیں‘ لیکن ایک سائنس دان نے اس کا غور سے مشاہدہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ زمین میں کوئی قوت ہے‘ کوئی کشش ثقل ہے جو ان چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ایسے ہی کسی نے آگ کے اوپر دیگچی میں پانی کو کھولتے ہوئے دیکھا کہ بھاپ کی وجہ سے دیگچی کا ڈھکن ہل رہا ہے تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی طاقت وقوت ہے جو اس ڈھکن کو ہلا رہی ہے۔ چنانچہ بھاپ کے اندر اللہ نے جو قوت رکھی ہے وہ انسان کو معلوم ہو گئی اور سٹیم انجن دریافت ہو گئے۔

یہ انسانی علم کا تدریجاً ارتقاء ہو رہا ہے‘ لیکن اس علم کا مدار انسان کے مشاہدے پر ہے۔ اُس نے کوئی شے‘ کوئی قدرتی عمل (phenomenon) دیکھا اور اس کے لیے

کوئی نام یا عنوان تجویز کیا۔ انہی ناموں اور عنوانات (terms) کے ذریعے سے ہی انسان نے اپنی معلومات کو منضبط و مرتب کیا اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ایک نسل سے اگلی نسل کو منتقل ہوا۔ یہ ''علم الاسماء'' حضرت آدمؑ کو گویا پورے کا پورا بِالقُوّہ (potentially) دے دیا گیا۔ تمام مادّی اور سائنسی علوم اُسی کی exfoliation اور اُسی کا ظہور ہیں۔ جیسے کہ بیج اور گٹھلی کے اندر پورا درخت بِالقُوّہ موجود ہوتا ہے اور اسی میں سے وہ برآمد ہوتا ہے۔ اس کو ہم یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے جو ذرائع و آلات ہیں وہ حضرت آدمؑ کو عطا کر دیے گئے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾ (الاسراء) ان کو وہ استعدادات عطا کر دی گئیں جن کے ذریعہ سے انسان کو تمام مادّی علوم حاصل ہونے والے تھے۔ یہ اس کی مختلف تعبیرات ہوں گی۔

اکثر و بیشتر مفسّرین نے علم الاسماء سے یہی اشیاء کا علم یعنی مادّی اور سائنسی علم مراد لیا ہے۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک بات ذرا ہٹ کر کہی ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذُرّیت کے نام ہیں۔ دلیل اُن کی یہ ہے کہ یہاں جو ضمیریں اور اشارے وغیرہ استعمال ہوئے ہیں وہ عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل و ادراک اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا: ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ ''پھر پیش کیا اُن کو ملائکہ کے سامنے۔'' یہ ھُم کی ضمیر ذوی العقول کے لیے ہے۔ اسی طرح: ﴿اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ ''مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔'' ﴿يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ ''اے آدم! ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کرو۔'' اس سے انہوں نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ اصل میں حضرت آدم علیہ السلام کی تمام ذُریت کی تخلیق ارواح کی شکل میں ہو چکی تھی‘ تو اُن میں جو عظیم شخصیات پیدا ہونے والی تھیں‘ جن میں عظیم ترین ہستی محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں‘ انہی میں حضرت نوح‘ حضرت ابراہیم‘ حضرت اسماعیل‘ حضرت اسحاق‘ حضرت یعقوب‘ حضرت موسیٰ‘ حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں‘ تو ان کا گویا مشاہدہ کرایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے نام بتا دیے گئے اور پھر

فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کر دیا گیا۔ اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کی ذُرّیت کے متعلق گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پا کر زمین میں فساد مچائے گی‘ خون ریزیاں کرے گی۔ اس گمان کی تردید کے لیے ان کو ذُرّیتِ آدم کا مشاہدہ کرایا گیا‘ تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ اگر اولادِ آدمؑ کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خیر کے پیکر اور ہر اعتبار سے نیکی و بھلائی کے علَم بَردار ہوں گے۔

یہ مولانا اصلاحی صاحب کی رائے ہے اور ایک اعتبار سے اس میں کچھ وزن بنتا ہے کہ یہاں ضمائر وہ آئی ہیں جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتی ہیں‘ لیکن اکثر و بیشتر مفسّرین کی رائے وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی۔ اس اختلاف کا جواب یہ ہوگا کہ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام علم الاسماء دے دیا گیا تھا تو اس میں اشخاص بھی شامل تھے اور اشیاء بھی۔ اس اعتبار سے برسبیلِ تغلیب ضمائر وہ استعمال کر دی گئیں جو ذوی العقول کے لیے آتی ہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ انہی پر حصر ہو رہا ہو۔ میرے نزدیک بھی اصل موضوع ’’خلافت‘‘ سے زیادہ مناسبت اور تعلق رکھنے والی رائے یہی ہے کہ یہ علم الاسماء وہ علم ہے جو انسان نے اپنے ذرائع اور مشاہدے سے تدریجاً حاصل کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو وہ پورے کا پورا علم بِالقُوّۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا تھا جو کائنات کو مسخر کرنے کے لیے درکار تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (لقمان: ۲۰) ’’(لوگو!) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لیے ان تمام چیزوں کو مسخر فرما دیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیۃ: ۱۳) ’’اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تمہارے لیے مسخر کر دیا۔‘‘

آیت ۲۹ میں جو الفاظ آئے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ

جَمِیۡعًا﴾ ’’وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے‘‘ وہاں صرف زمین کا معاملہ ہے۔ ہماری ضروریات کی بہم رسانی کے لیے اور جہاں تک ہماری دسترس ہے اس کی حد تک تو زمین میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ ہمارے لیے ہے۔ ہمیں خلافتِ ارضی دی گئی ہے‘ پوری کائنات کی خلافت نہیں دی گئی۔ البتہ علم کی وہ بنیاد حضرت آدم علیہ السلام ذُرّیتِ آدمؑ کو عطا کر دی گئی جس کے نتیجے میں وہ کائنات کی تسخیر کر سکیں گے۔ قوائے فطریہ (forces of the nature) کی دریافت اور پھر ان کو اپنے کنٹرول میں لانا‘ ان سے فائدہ اٹھانا تسخیر کائنات ہی کی طرف انسان کا قدم ہے۔ آج انرجی کے مختلف خزانے جس طرح انسان کے اختیار میں آتے چلے جا رہے ہیں‘ چاند تک اُس کی رسائی ہو چکی ہے‘ مریخ پر کمند ڈالنے کو تیار ہے‘ یہ تسخیرِ کائنات ہی کا سفر ہے۔ یہ تسخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کردہ صلاحیتوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔ اصلاً یہ شر (evil) نہیں ہے۔ اسے اس چیز نے شر بنا دیا ہے کہ اس کے ساتھ جو روحانی ترقی ہونی چاہیے‘ ایمان باللہ ہونا چاہیے‘ اصل حقائق انسان کے سامنے رہنے چاہئیں وہ فراموش کر دیے گئے ہیں۔

انسان کو اپنی حیثیت خالقِ کائنات کے حوالے اور نسبت سے سمجھنی چاہیے۔ اگر انسان کی نظروں سے یہ چیزیں اوجھل ہو جائیں اور صرف عالَمِ مادّی اور یہ دنیا ہی اس کے پیشِ نظر رہ جائے تو پھر یہ وہی کانے دجال والا تصور ہے۔ دجال کے بارے میں احادیث میں جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کے اندر یہی تسخیر کا معاملہ ہے‘ لیکن دجال کی صرف ایک آنکھ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک آنکھ یہ علم انسانی ہے کہ جس سے اُس کی ساری کی ساری استعداد‘ اُس کی مشینری‘ اُس کے سارے آلات و ذرائع انسان میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک علم ہے جس کا دائرہ اور دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے اور میدان وسیع ہے۔

دوسرا علم وہ ہے کہ جس کے ذکر پر یہ رکوع ختم ہوگا: ﴿فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى ……﴾ ’’تو جب جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی …..‘‘

یہ علم وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے نازل فرمایا۔ یہ سلسلۂ ہدایت حضرت آدم علیہ السلام ہی سے شروع ہوا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر تکمیل پذیر ہوا۔ یہ مضامین بھی تعارفِ قرآن کے ضمن میں تفصیل سے عرض کیے جا چکے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے: العلم علمان: علم الابدان و علم الادیان (علم دو ہیں: جسمانی علم اور دینی علم) یعنی ایک مادّی علم اور دوسرا علم ہدایت جو وحی کے ذریعہ سے انسان کو حاصل ہوا۔ مادّی علم کا ذریعہ ہمارے حواس اور ہماری عقل ہے۔ درحقیقت اسی سے سارا فساد پیدا ہوا ہے کہ جب وحی کے علم سے انسان نے منہ موڑ لیا‘ اس ہدایت کو اُس نے ترک کر دیا‘ اس کی پیروی اختیار کرنی چھوڑ دی‘ تو اب یہ مادّی ترقی اُس کے گلے کا طوق بن گئی ہے۔ اس کے زیرِ اثر تخریبی قوتیں (destructive forces) جمع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ سوویت یونین (USSR) کی ٹوٹ پھوٹ (disintegration) کے بعد مغرب میں سخت تشویش ہے کہ پینتیس ہزار ایٹمی وارہیڈز ان نئی وجود میں آنے والی چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں کے ہاتھ آ گئے ہیں‘ لہٰذا انہیں فوری طور پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خبر تو یہاں تک آئی تھی کہ امریکہ اپنی فوجیں اتارنے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے کہ وہ چند ایٹم بم تو پورے امریکہ کی تباہی کے لیے کافی ہیں‘ بلکہ شاید پوری دنیا کی ہلاکت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس کے علاوہ ہائیڈروجن بم اور نہ جانے کتنی کچھ ہلاکت آفریں قوتیں انسان نے جمع کر لی ہیں۔ درحقیقت یہ سائنسی ترقی دجالیت اسی وجہ سے بن گئی ہے کہ اب یہ علم یک رُخا ہو گیا ہے‘ دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ بند ہے۔ وحی کی طرف سے انسان نے اپنی آنکھ بند کر لی اور صرف مادّی علم کا دائرہ آگے بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ معلومات کا ذخیرہ بے انتہا بڑھتا چلا گیا۔ ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے۔ خلا میں انسان بہت دُور تک ہو کر آ گیا ہے۔ درحقیقت یہ سب علم الاسماء کی exfoliation ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا‘ اور خلافت کا تعلق اسی علم سے ہے۔

خلافت کے علاوہ دوسرا لفظ ہے امامت۔ امامت کا تعلق درحقیقت وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم ہدایت سے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی حکومت زمین

میں قائم نہیں ہوئی تھی، لیکن آپؑ کو جو چیز دی گئی وہ ہے امامت۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (البقرۃ: ۱۲۴)۔ واضح فرما دیا گیا کہ اب آپؑ ہی کی ذُرّیت میں نبوت و رسالت رہے گی، کتابیں آئیں گی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور تمام انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ذُرّیتِ ابراہیمؑ میں سے ہیں۔ امامت کا تعلق علم وحی سے ہے لیکن خلافت جو زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کی گئی اس کی بنیاد درحقیقت یہ علم انسانی ہے جس کو یہاں ''علم الاسماء'' سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا﴾

حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء عطا کر کے فرشتوں کے سامنے لانے میں بھی کوئی مقابلہ کرانا پیش نظر نہیں تھا، صرف یہ حقیقت بتانا مقصود تھا کہ یہ علم جو ہم آدمؑ کو دے رہے ہیں اس کی بنیاد پر یہ خلافتِ ارضی کا حق دار اور اس کا اہل ہے۔ بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ اگرچہ فرشتوں کے پاس بھی علم ہے، لیکن ان کا علم صرف اپنے اپنے شعبے تک محدود ہے۔ کسی فرشتے کی خدمات جس شعبہ سے وابستہ ہیں اُس کے پاس اسی سے متعلق معلومات ہیں، جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء کُل کا کُل دیا گیا۔ اسی اعتبار سے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا﴾ میں لفظ کُل پر زور ہے۔ یعنی وہ علم جو کلیت کا حامل ہے۔ جسے ابھی وقت لگنا تھا کہ پورے طور پر اُس کا ظہور ہو۔ فرشتوں کا علم محدود تھا، لہٰذا انہوں نے کہا: ﴿سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا﴾ ''اے اللہ! تُو پاک ہے، ہمیں تو کوئی علم حاصل نہیں، سوائے اُس کے جو علم تُو نے ہمیں سکھایا ہے۔'' اس سے زائد ہمارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

﴿اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾﴾ ''یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے، کامل حکمت والے ہیں۔'' بے شک العلیم اور الحکیم تو صرف آپ کی ذات ہے۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے۔ آپ ہی کی ذات ہے جو کُل کے کُل علم کی مالک ہے اور جس کی حکمت بھی کامل ہے۔ باقی مخلوق میں سے ہر ایک کا علم ناقص ہے۔

﴿قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ﴾ ''اللہ نے فرمایا کہ اے آدم! ان کو بتاؤ ان

چیزوں کے نام!‘‘

﴿فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَھُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ﴾ ’’تو جب اُس نے بتادیے ان کو اُن سب کے نام‘‘

﴿قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ﴾ ’’تو (اللہ نے) فرمایا: کیا مَیں نے تم سے کہا نہ تھا کہ مَیں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزوں کو‘‘ (جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہیں۔)

﴿وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور مَیں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔‘‘

ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ فرشتوں کی خواہش یہ تھی کہ خلافت ہمیں ملے۔ ہم خُدّامِ ادب ہیں‘ ہر وقت تسبیح وتحمید اور تقدیس میں مصروف ہیں‘ جو حکم ملتا ہے بجالاتے ہیں‘ تو یہ خلافت کسی اور مخلوق کو کیوں دی جا رہی ہے؟ سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی کلمۂ ملامت بنتا ہے کہ ایک بات تو وہ تھی جو تم نے کہی‘ ایک پہلو اور بھی تھا جو تم نے جی میں رکھا‘ اُسے ظاہر نہیں کیا۔ اس سے انسان کا ذہن ادھر ہی جاتا ہے کہ فرشتوں کو یہ احساس ہوگا کہ ہم اس خلافت کے اہل ہیں۔ اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے صرف اس اعتبار سے اشارہ کر دیا کہ میرے علم میں یہ بھی ہے جو تم نے اپنے جی میں چھپایا ہوا تھا۔ البتہ میری طرف سے یہ demonstration ہو جانے کے بعد اب تمہارا وہ سارا اشتباہ یا اشکال رفع ہو جانا چاہیے۔ (جاری ہے)

ماهنامه ”میثاق“ لاهور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

روح کا سفر اور حالاتِ برزخ

شجاع الدین شیخ‘ امیر تنظیم اسلامی

جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں ۴ ستمبر ۲۰۲۶ء کا خطابِ جمعہ

آج کی نشست میں‘ ان شاء اللہ تعالیٰ‘ ہم رسول اکرم ﷺ کی ایک خاصی طویل حدیث کا مطالعہ کریں گے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور گزرتے ایام میں انسان پر غفلتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں قرآن حکیم میں جابجا اور احادیثِ مبارکہ میں متعدد مرتبہ قبر اور برزخ کے حوالے سے‘ جنّت و جہنّم کے ذکر کے حوالے سے ہمیں متوجہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث مبارک کو مسند احمد میں بھی نقل کیا گیا‘ امام بیہقیؒ اور امام حاکم نے بھی نقل فرمایا‘ جبکہ اس کے مختلف حصے احادیث کی دیگر کتب میں بھی شامل ہیں۔ اکثر محدثین نے اس حدیث مبارک کو صحیح قرار دیا ہے۔ ہمارے عہد کے مستند محدث شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو اپنی کتب میں نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے تعلق سے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔

عَنِ البراء بن عازب رضي الله عنه، قال: خرجْنا مع رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ في جنازةِ رَجُلٍ مِنَ الأنصارِ، فَانْتَهينا إلى القبرِ ولمَّا يُلحَدْ، فجَلَسَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَ جلَسنا حولَهُ كأنَّما على رُءوسِنا الطَّيرُ، وَفي يَدِهِ عُودٌ يَنْكُتُ بِهِ في الأرضِ، فرَفعَ رَأسَهُ، فقالَ: ((اِسْتَعِيذُوا بِاللّٰهِ مِنْ عَذابِ القَبرِ)) مَرَّتينِ، أو ثلاثًا۔

’’حضرت برا بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک انصاری صحابی کے جنازے میں نکلے۔ جب ہم قبر کے پاس پہنچے تو ابھی لحد تیار نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے اردگرد اس طرح

بیٹھ گئے گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں (یعنی ہم نہایت خاموشی سے اور توجہ سے سن رہے تھے)۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس سے آپ زمین کُرید رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور دو یا تین مرتبہ فرمایا کہ قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو!''

اس حدیث کی روشنی میں بہت سارے نکات سامنے آتے ہیں‘ مثلاً جنازے میں اور تدفین میں شرکت کرنا۔ اس سے ثواب بھی ملتا ہے‘ عبرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی بات سننے کے لیے ایسے باادب بیٹھے کہ جیسے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس سے آپ زمین کو کُرید رہے تھے۔ اس سے بھی بہت سے نکات اخذ کیے گئے ہیں کہ یہ طرزِ عمل غور و فکر میں توجہ حاصل کرنے کے لیے‘ ذہنی ارتکاز کے حصول کی خاطر ہوتا۔ اسی کیفیت میں اللہ کے رسول ﷺ نے (راوی کہتے ہیں کہ دو یا تین مرتبہ) فرمایا: ((اِسْتَعِیْذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ)) ''قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' اللہ کے رسول ﷺ صرف زبانی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ عملی راہنمائی بھی فراہم کرتے تھے۔ ہر نماز کے آخر میں جو مسنون دعائیں ہمیں اللہ کے رسول ﷺ سے منقول ملتی ہیں‘ ان میں یہ دعا بھی شامل ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ))

''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے بندۂ مومن کے انتقال کے بعد کے کچھ حالات کے حوالے سے فرمایا:

((إنَّ العبدَ المُؤمِنَ إذا كان في انقِطاعٍ مِنَ الدُّنيا و إقبالٍ مِنَ الآخرةِ، نزل إليه مَلائكةٌ مِنَ السّماءِ، بِيضُ الوُجوهِ، كانَّ وُجُوهَهم الشّمسُ، معهم كَفَنٌ مِن أكفانِ الجنَّةِ، و حَنوطٌ مِن حَنوطِ الجنَّةِ، حتى يجلسوا منه مدَّ البصر، ثُمَّ يَجيءُ مَلكُ الموتِ عليه السلام حتى يجلسَ عند رأسِه فيقولُ: أيَّتُها النفسُ الطيبةُ اخرجي إلَى مَغفِرةٍ من اللهِ و رِضوانٍ))

''بے شک جب مؤمن بندہ کے دنیا سے رخصت ہونے اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہوتا ہے تو آسمان سے سفید چہروں والے فرشتے اترتے ہیں۔ ان کے

چہرے سورج کی طرح چمک دار ہوتے ہیں‘ ان کے پاس جنّت کا کفن اور جنّت کی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ (فرشتے کثرت سے آتے ہیں اور) اُس کے پاس حدِنگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت (حضرت عزرائیل) علیہ السلام اُس کے سرہانے بیٹھ کر کہتے ہیں: اے پاکیزہ نفس! اللہ کی بخشش اور اس کی رضا کی طرف نکل۔“

ظاہر پرست اور مادّہ پرست لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے مگر غیب پر ایمان لانے والے انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ میرا اور آپ کا ایمان اسی بات پر قائم ہے: تصدیق بما جاء النبی ﷺ۔ ایمان کی ٹیکنیکل تعریف یہ ہے کہ ہر وہ خبر جو رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی اس کی تصدیق کی جائے۔ ایک کفن اور خوشبو دنیا والے تیار کرتے ہیں‘ جبکہ اللہ تعالیٰ آسمان سے روشن چہرے والے فرشتوں کو بھیج رہا ہے جن کے پاس جنّت کا کفن اور جنّت کی خوشبو ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! یہ مرنے کے ساتھ ہی بشارت کا معاملہ ہے۔ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ ابھی ساتوں آسمانوں کی سیر بھی اس پاک روح کو میسر آئے گی۔ یہ وہ بندۂ مؤمن ہے جو ایمان کے تقاضوں پر بھی عمل کرے۔ مزید فرمایا:

((فتخرجُ تَسِيلُ كمَا تَسِيلُ القطرةُ مِنْ فِيّ السِّقاءِ، فيأخُذُها، فإذا أخذَها لَمْ يَدَعُوها في يَدِهِ طَرفةَ عَين، حتى يأخُذُوها فيَجْعَلُوها في ذٰلك الكفن، وفي ذٰلك الحَنُوط، و يَخرُجُ منها كأطْيَبِ نفحةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ علَى وَجْهِ الأرض))

”تو وہ روح اس طرح آسانی سے باہر نکلتی ہے جیسے مشکیزے کے منہ سے پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے۔ ملک الموت اسے حاصل کر لیتے ہیں‘ اور جیسے ہی وہ اسے لیتے ہیں‘ دوسرے فرشتے اسے پلک جھپکنے کے برابر وقت کے لیے بھی ان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے‘ یہاں تک کہ وہ اسے لے کر جنّت کے کفن اور جنّت کی خوشبو میں رکھ دیتے ہیں۔ اس سے زمین پر پائے جانے والی بہترین مشک جیسی خوشبو مہکنے لگتی ہے۔“

البتہ قرآن کریم میں موت کی سختی کا ذکر بھی ہے۔ سورۃ قٓ میں فرمایا:

﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

”اور آ گئی موت کی سختی حق کے ساتھ۔“

رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری لمحات میں فرمایا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اِنَّ لِلْمَوتِ سَكَرَاتٌ، اِنَّ لِلْمَوتِ سَكَرَاتٌ،اِنَّ لِلْمَوتِ سَكَرَاتٌ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' یقیناً موت کی سختی ہے۔'' (بار بار فرمایا)

اللہ کے رسول ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ))

''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں موت کی سختی سے۔''

''سکراتِ موت'' کی کیفیت سب پر طاری ہوتی ہے۔ البتہ پھر مؤمن کے ساتھ یہ معاملہ بھی ہے جو اس روایت میں نقل کیا جا رہا ہے کہ روح اس طرح آسانی سے بہ نکلتی ہے جیسے مشکیزے کے منہ سے پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے۔ اس کے آگے ذکر ہے:

((فَيَصْعِدُون بها فلا يَمُرُّونَ عَلَى مَلأٍ مِنَ الملائكةِ إلَّا قالوا: ما هذا الرُّوحُ الطيّبُ؟ فيقولون: فُلانُ ابنُ فُلان - بِأحسنِ أسمائِهِ التي كانوا يُسَمُّونه بها في الدُّنيا، حتى ينتهوا بها إلى السّماءِ الدُّنيا، فيَسْتَفْتِحُون لَهُ فَيُفْتَحُ لَهُمْ، فَيُشِيعُهُ مِنْ كُلِّ سَماءٍ مُقَرَّبُوها إلى السَّماء التي تَلِيها، حتى يَنتهوا بها إلى السَّماء السَّابِعة، فيقولُ اللّٰهُ عزّ وَجَلَّ: اكتُبُوا كِتابَ عَبْدِي في عِلِيّينَ، وَ أعِيدُوهُ إلى الأرضِ، فإنِّي مِنها خَلَقْتُهُمْ، وَ فِيها أُعِيدُهم وَ مِنها أُخْرِجُهُمْ تارةً أُخْرَى))

''فرشتے اس روح کو لے کر اوپر کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ وہ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ: یہ کون سی پاکیزہ روح ہے؟! وہ دنیا میں پکارے جانے والے اُس کے بہترین نام کے ساتھ بتاتے ہیں کہ فلاں کا بیٹا فلاں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے لے کر آسمانِ دنیا (پہلے آسمان) پر پہنچتے ہیں۔ وہ (اصولوں کے مطابق) دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں تو ان کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ ہر آسمان کے مقرب فرشتے اگلے آسمان تک اس کی مشایعت میں چلتے ہیں' یہاں تک کہ وہ اسے لے کر ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''میرے اس بندے کا نامہ اعمال علّیّین میں لکھ دو (عِلِّیّین کا لفظ سورۃ المطففین میں آیا ہے) اور اسے زمین کی طرف واپس لوٹا دو' کیونکہ مَیں نے انہیں مٹی ہی سے پیدا کیا'

اسی میں انہیں لوٹاؤں گا اور اسی سے دوبارہ نکالوں گا۔‘‘

آسمانوں کے دروازے اصولوں کے مطابق کھلتے ہیں‘ ہر ایک کو دروازہ کھلوانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ معراج کا واقعہ ذہن میں رہے۔ اس روح کے لیے بھی دروازہ اصولوں کے مطابق کھلتا ہے۔ اس طرح روح کا یہ سفر آگے سے آگے بڑھتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ((فإنِّي مِنها خَلَقْتُهُمْ، وَ فِيها أُعِيدُهم وَ مِنها أُخرِجُهُمْ تارةً أُخرٰى)) سے بعض حضرات کو سورۃ طٰہٰ (آیت ۵۵) کے الفاظ یاد آئے ہوں گے۔ زیر مطالعہ حدیث میں آگے فرمایا:

((وَتُعـادُ رُوحُه في جَسَدِهِ، فيأتيهِ مَلكـان فَيُجْلِسانِـه فيقولان لَهُ: مَن رَبُّكَ؟ فيقول: ربّي اللّٰهُ، فيقولانِ لَهُ: ما دِينُك؟ فيقولُ: دِيني الإسلامُ، فيقولان لَهُ: ما هٰذا الرجلُ الذي بُعِثَ فيكم؟ فيقولُ: هو رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم، فيقولان لَهُ: وما عَمَلُك؟ فيقول؟ قرأتُ كِتابَ اللّٰه، فآمَنْتُ بِهِ، وصَدَّقتُ، فيُنادي مُنادٍ في السَّماء أنْ صَدق عبدي، فأفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وألْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوا لَهُ بابًا إلَى الْجَنَّةِ، قال: فَيَأتِيه مِن رُوحِها و طِيبِها، ويُفْسَحُ لَهُ في قبرهِ مدَّ بَصَرِهِ، قال: ويأتيه رجلٌ حَسَنُ الْوَجه، حَسَنُ الثِّيابِ، طيِّبُ الريحِ، فيقولُ: أبشِر بالذي يَسُرُّكَ، هٰذا يومُكَ الذي كُنْتَ تُوعدُ، فيقولُ لَهُ: منْ أنتَ؟ فوجهُكَ الوجهُ يجيءُ بالخيرِ، فيقولُ: أنا عَمَلُكَ الصالحُ ، فيقول: رَبِّ أقِمِ السَّاعة، حتىٰ أرجع إلى أهلي ومالي))

’’چنانچہ اُس کی روح اُس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے (منکر نکیر) آتے ہیں اور اسے بٹھا کر پوچھتے ہیں: تمہارا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا رب اللہ ہے! پھر پوچھتے ہیں: تمہارا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا دین اسلام ہے! پھر اُس سے پوچھتے ہیں: یہ شخص کون ہیں جو تمہارے درمیان مبعوث کیے گئے؟ وہ جواب دیتا ہے: یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ (احادیث کی بعض روایات میں یہ ذکر بھی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ انور پیش کیا جائے گا۔) پھر وہ پوچھتے ہیں: تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ وہ جواب دیتا ہے: مَیں نے اللہ کی کتاب پڑھی‘ اس پر ایمان لایا اور تصدیق کی۔ اس کے بعد آسمان سے ایک ندا دینے والا (اللہ تعالیٰ کی

طرف سے) پکارتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ (اس کے بعد کہا جاتا ہے) اس کے لیے جنّت کا بچھونا بچھا دو‘ اسے جنّت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنّت کا ایک دروازہ کھول دو۔ (چنانچہ اس کے لیے یہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے) یہاں سے جنّت کی لطیف ہوائیں اور خوشبوئیں اس کے پاس آنے لگتی ہیں اور اس کی قبر کو حدِ نگاہ تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک خوب صورت چہرے‘ نفیس لباس اور بہترین خوشبو والا شخص اُس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں اُس چیز کی خوش خبری ہو جو تمہیں خوش کر دے۔ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مؤمن اس سے پوچھتا ہے: تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ تو بھلائی ہی لانے والا معلوم ہوتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے: مَیں تمہارا عمل صالح ہوں۔ اس پر بندۂ مؤمن پکار اٹھتا ہے: ’اے میرے ربّ! قیامت ابھی قائم کر دے‘ تاکہ مَیں اپنے اہل وعیال اور اپنے مال کی طرف لوٹ سکوں۔‘‘

اصل مال اور اہل وعیال جنّت میں ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ اسے کہا جائے گا: ابھی تو تُو نے یہیں رہنا ہے۔ ابھی یہ برزخ ہی کا معاملہ رہے گا‘ قیامت تو اپنے وقت پر برپا ہو گی۔

روح کے حوالے سے استاد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے دروس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک عالَمِ امر کا معاملہ ہے جبکہ ایک عالَمِ خلق کا معاملہ۔ عالَمِ امر میں فرشتے بھی ہیں‘ وحی بھی ہے اور انسان کی روح بھی ہے۔ عالَمِ امر کے لیے ٹائم فیکٹر زیرو ہے۔ دراصل یہ کسی اور ہی عالَم کی سیر ہے جو اس حدیث مبارک میں ہمیں کرائی جا رہی ہے۔

آج ہمیں بہت سارے سوالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بہت سارے سٹیٹس اَپ ڈیٹس ہیں‘ بہت ساری ہیڈ لائنز ہیں‘ لیکن ان سوالات کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا جو ہم سے قبر میں پوچھے جائیں گے۔ یہ باتیں کہیں ذکر میں نہیں آتیں‘ نہ سیٹلائٹ چینل پر‘ نہ اخبارات کی ہیڈ لائنز میں‘ نہ ہماری گفتگو میں۔ دنیا اگرچہ ایک حقیقت ہے لیکن اصل حقیقت نہیں ہے۔ یہاں پر ہمیشہ نہیں رہنا۔ دُنیا عمل کا موقع ہے جبکہ آخرت نتیجے کا موقع ہے۔ اس آخرت کی تیاری کے لیے ہمیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

متذکرہ بالا سوالات میں سے چوتھا سوال عام طور پر بیان میں نہیں آتا کہ: ’’تم کیسے کہہ رہے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں؟‘‘ بندۂ مؤمن جواب دیتا ہے کہ مَیں نے اللہ کی کتاب

پڑھی‘ اس پر ایمان لایا اور تصدیق کی۔ اس بنیاد پر میں جانتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام ﷢ سے پوچھا: ’’کیا تم جانتے ہو کہ سب سے خوب صورت ایمان کس کا ہے؟‘‘ صحابہؓ نے عرض کیا: فرشتوں کا! حضور ﷺ فرماتے ہیں: ’’وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں!‘‘ وہ تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا ظہور دیکھ رہے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: انبیاء اور رسل کا ایمان! رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’وہ کیسے ایمان نہ لاتے‘ ان پر تو اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔‘‘ پھر صحابہؓ نے عرض کیا: حضور ﷺ! پھر ہمارا ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ مَیں تمہارے مابین بنفس نفیس موجود ہوں۔‘‘ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ إِلَيَّ إِيمَانًا لَقَوْمٌ يَكُونُونَ مِنْ بَعْدِي يَجِدُونَ صُحُفًا فِيهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُونَ بِمَا فِيهَا)) [مشكاة المصبيح، كتاب المناقب، ح۶۲۸۸]

’’میرے نزدیک مخلوق میں خوب صورت ترین ایمان ان لوگوں کا ہے جو میرے بعد ہوں گے (ان کو میری صحبت میں سے حصہ نہیں ملے گا)‘ وہ صحیفے پائیں گے‘ ان میں ایک کتاب ہوگی‘ وہ اس میں موجود حقائق پر ایمان لائیں گے۔‘‘

افضل الگ شے ہے‘ یہاں خوب صورت ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ بلاشبہ افضل ایمان تو انبیاء و رُسل اور صحابہ کرامؓ ہی کا ہے۔ البتہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: سب سے خوب صورت ایمان ان کا ہوگا جن کو یہ قرآن ملے گا اور وہ مانیں گے کہ یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔

ایک اور ذرا گہری بات۔ قرآن کریم میں دجال کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ سورۃ الکہف کی تلاوت جمعہ کے دن کرنے کا کہا گیا ہے‘ لیکن اس میں بھی دجال کا ذکر نہیں۔ عالَمِ عرب کے ایک عالمِ دین نے بڑی پیاری بات لکھی کہ جو سُنّت کی اتھارٹی تسلیم نہیں کرے گا وہ دجال کے فتنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ حدیث میں دجال کو پہچاننے کا طریقہ یہ درج ہے کہ بندۂ مؤمن اپنی ایمانی بصیرت کی روشنی میں دجال کے ماتھے پر ’’ک ف ر‘‘ لکھا ہوا دیکھے گا۔ اگر ایمانی بصیرت کی روشنی میں ایک بندۂ مؤمن دجال کو پہچان سکتا ہے تو کیا وہ اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں پہچانے گا؟ بعض نومسلم کہتے ہیں کہ جس لمحے ہم نے کلمہ پڑھا‘ ہمیں اپنے اندر کچھ محسوس ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ﷫ نے لکھا ہے کہ جیسے سورج کی کرنیں ہر طرف روشنی پھیلاتی ہیں تو حضور ﷺ کی

ذات وہ سورج ہے جس سے ایمان کی کرنیں ایمان والوں کو ملیں۔ دل میں اگر یہ ایمان ہوگا تو اس کی روشنی میں حضرت محمد ﷺ کو ہم پہچانیں گے‘ ان شاء اللہ تعالیٰ!

حدیث مبارک کا ایک حصہ مکمل ہوا جہاں خوش خبری کا پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو یقین بھی عطا کرے اور کل کی تیاری کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ ہم بھی بدلتے حالات میں ذرا ظاہر ہی میں کھو جاتے ہیں جبکہ اصل حقائق کو بھلا دیتے ہیں۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد موت آئے گی‘ یا پھر ۷۰، ۸۰ کی عمر کے بعد آئے گی۔ بچوں کی شادیاں‘ ان کی خوشیاں‘ اُن کے بچوں کی بہاریں دیکھ لوں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ موت کسی عمر میں بھی آ سکتی ہے۔ تین سانس والا بچہ بھی جاتا ہے‘ ڈیڑھ برس والی بچی بھی جاتی ہے۔ مَیں نے خود بچوں کے جنازے پڑھائے‘ خود اپنے ہاتھوں سے دفن کیے۔ اس حوالے سے کوئی ضمانت (surety) نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو تیاری کی توفیق عطا فرمائے!

حدیث مبارک کے اگلے حصے میں اِنذار (warning) ہے‘ ڈراوا ہے۔ کافروں‘ فاجروں‘ فاسقوں‘ نافرمانوں کے لیے برے انجام کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((وإنَّ العَبْدَ الكافِرَ إذا كان في انقطاعٍ مِنَ الدُّنيا و إقبالٍ من الآخرةِ، نَزَلَ إليه مِنَ السَّماء مَلائكةٌ سُودُ الوُجُوهِ، مَعَهم المُسُوحُ، فيجلِسون منه مدَّ البصر، ثم يجئُ ملكُ الموتِ حتى يجلسَ عند رأسِه، فيقولُ: أيَّتُها النَّفسُ الخبيثةُ اخْرُجي إلَى سَخَطٍ مِنَ اللهِ وَ غَضبٍ، قال: فتفرَّقُ في جَسَدِهِ فينتزِعُها كَمَا يُنتَزع السُفودُ مِنَ الصُّوفِ المبلولِ، فيأخذها، فإذا أخذها لَمْ يدَعُوها في يَدِهِ طرفةَ عينٍ حتى يجعلُوها في تلك المُسُوحِ، وَ يَخْرُجُ منها كريحِ جِيفةٍ وُجِدَتْ على وجهِ الأرض، فيصعدُون بها، فلا يمُرُّون بها على ملأ من الملائكةِ إلّا قالوا: ما هٰذا الرُّوحُ الخبيثُ؟ فيقولون: فلانُ ابنُ فلان - بأقبحِ أسمائِه التي كان يُسَمَّى بها في الدُّنيا، حتى يُنتهى بها إلى السَّماءِ الدُّنيا، فيُستَفتح له، فلا يُفتحُ له)) ثم قَرأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ أَبۡوَٰبُ ٱلسَّمَآءِ وَلَا يَدۡخُلُونَ ٱلۡجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ ٱلۡجَمَلُ فِي سَمِّ ٱلۡخِيَاطِ﴾

’’جب کافر (یا فاجر) بندہ دنیا سے رخصت ہونے اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کے

قریب ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ چہروں والے فرشتے اترتے ہیں‘ جن کے پاس ٹاٹ ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کے پاس حدِ نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت تشریف لاتے ہیں اور اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتے ہیں: اے خبیث نفس! اللہ کے غضب اور اُس کی ناراضگی کی طرف نکل۔ تو وہ روح اس کے پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے یوں کھینچ کر نکالتے ہیں جیسے گیلے اون سے لوہے کی کثیر شاخوں والی سیخ کھینچی جاتی ہے۔ (روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے رگیں اور پٹھے کٹ جاتے ہیں۔) جب وہ فرشتے اس (روح) کو حاصل کرتے ہیں تو پلک جھپکنے کے برابر وقت بھی اسے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے اور فوراً اس ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس سے زمین پر پائی جانے والی بدترین مخلوق جیسی تعفن آمیز بدبو نکلنے لگتی ہے۔ فرشتے اسے لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں‘ وہ پوچھتے ہیں: یہ کون سی ناپاک روح ہے؟ فرشتے دُنیا میں پکارے جانے والے اس کے بدترین نام کے ساتھ بتاتے ہیں کہ فلاں کا بیٹا فلاں ہے۔ جب وہ اسے لے کر آسمانِ دنیا تک پہنچتے ہیں اور پہلا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں تو اُس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الۡجَمَلُ فِىۡ سَمِّ الۡخِيَاطِ﴾ (الاعراف:۴۰)

’’اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنّت میں داخل ہوں گے‘ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔‘‘

جیسے یہ ظاہری طور پر ممکن نہیں‘ ایسے ہی ان لوگوں کا جنّت میں داخلہ بھی ممکن نہیں۔ حدیث مبارک کے اگلے الفاظ ہیں:

((فیقولُ اللّٰہُ عزّ و جلّ: اکتُبُوا کِتابَهُ في سِجِّين، في الأرض السُّفلَی، فتُطرَحُ رُوحُه مِنَ السَّماء طَرحًا حتی تقعَ في جسدِه، ثم قرأ: ﴿وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ﴿۳۱﴾﴾ ثم قال: فتُعادُ رُوحُه في جسدِه، ویأتیه ملکانِ و یُجلسانهِ، فیقوُلانِ لَهُ: مَنْ ربُّك؟ فیقول: هاه هاه لا أدري، فیقُولان لَهُ: ما

دِينُك؟ فيقولُ: هاه هاه لا أدري، فيقولانِ لَهُ: ما هٰذا الرَّجُلُ الذي بُعِثَ فيكم؟ فيقولُ: هاه هاه لا أدري))

''پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا نامہ اعمال سجین میں لکھ دو یعنی زمین کے سب سے نچلے حصے میں۔ (سِجِّین کا لفظ بھی سورۃ المطففین میں آیا ہے۔) پھر اس کی روح کو اُوپر ہی سے پٹخ دیا جاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱﴾ (الحج)

''اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو وہ گویا آسمان سے گر گیا' پھر اسے پرندے اچک لیں یا ہوا اسے کسی دُور دراز جگہ پھینک دے۔''

پھر اُس کی روح جسم میں دوبارہ لوٹائی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر پوچھتے ہیں: تمہارا ربّ کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے میری خرابی' میری تباہی' میری بربادی۔ ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔'' دوسرا سوال: ''تمہارا دین کیا ہے؟'' وہ کہتا ہے: ''ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔'' تیسرا سوال: ''یہ شخص کون ہیں جو تمہارے درمیان مبعوث کیے گئے تھے؟'' وہ کہتا ہے: ''ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔''

اس کے بعد حدیث کا اگلا حصہ ہے:

((فيُنادِي مُنادٍ مِنَ السَّماءِ أنْ: كذَبَ، فَأفْرِشُوا لَهُ مِنَ النَّارِ، وَافْتَحُوا لَهُ بابًا إلى النَّارِ، فيأتيهِ مِنْ حَرِّها وَ سمُومِها، وَيُضَيَّقُ عليه قبرُهُ حتى تختلفَ فيه أضْلاعُهُ، و يأتيهِ رجلٌ قبيحُ الوجهِ، قبيحُ الثياب، مُنتِنُ الرِّيحِ، فيقولُ: أبشِرْ بِالَّذِي يَسُوؤك، هٰذا يَوْمُك الذين كُنتَ تُوعَدُ، فيقولُ: مَنْ أنتَ؟ فوجهُك الوَجْهُ يجئ بِالشَّرِّ! فيقولُ: أنا عَمَلُكَ الخبيثُ، فيقول: رَبِّ لا تُقِمِ السَّاعَةَ))

''تب آسمان سے ایک ندا دینے والا پکارتا ہے: اس نے جھوٹ کہا' پس اس کے لیے آگ کا بچھونا بچھا دو' اسے آگ کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جہنّم کی طرف کا ایک دروازہ کھول دو۔ چنانچہ اس دروازے سے جہنّم کی لو اور گرم ہوا اُس کے پاس آنے لگتی ہے۔ اُس کی قبر اُس پر اس طرح تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ (استغفر اللہ! اس کے ساتھ یہ کام بار بار ہوتا ہے۔) پھر اُس

کے پاس ایک انتہائی بدصورت چہرے‘ قبیح لباس اور انتہا درجے کی بدبو والا شخص آ کر کہتا ہے: ’’تمہیں اس چیز کی بشارت ہو جو تمہیں غم ناک اور پریشان کر دے۔ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے: تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ تو برائی ہی لانے والا معلوم ہوتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے: میں تمہارا خبیث عمل ہوں۔ پس وہ کہتا ہے: اے ربّ! قیامت قائم نہ کرنا۔‘‘

ابھی تو عذابِ قبر ہے جس کو دیکھ کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ

’’اے اللہ! ہم تیری پناہ میں آنا چاہتے ہیں قبر کے عذاب سے۔‘‘

دیگر روایات میں اس کے تسلسل میں ایک اور حصہ بھی ہے۔ یہ شخص جو برے چہرے کے ساتھ آیا (یعنی اُس کا عمل) اس کو کہتا ہے: ’’اللہ کی قسم! میں تمہیں ہمیشہ اللہ کی فرماں برداری میں سست اور اس کی نافرمانی میں تیز پاتا تھا۔ پس اللہ تمہیں برا بدلہ دے۔ (لوگ کہتے ہیں کہ مولوی ڈراتے ہیں‘ سنیے اللہ کے رسول ﷺ کیا ڈرا رہے ہیں!) پھر اس پر ایک ایسا فرشتہ مسلط کر دیا جاتا ہے جو اندھا‘ بہرا اور گونگا ہوتا ہے (نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے)۔ اُس کے پاس لوہے کا ایک ہتھوڑا ہوتا ہے کہ اگر اس سے کسی پہاڑ پر ضرب لگائی جائے تو مٹی ہو جائے۔ وہ اسے ایک ضرب لگاتا ہے جس سے وہ مٹی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے پہلی حالت میں بحال فرما دیتا ہے اور وہ اسے دوبارہ ضرب لگاتا ہے۔ اس پر وہ اتنی تیز آواز سے چیختا ہے کہ انسان و جِنّات کے علاوہ مشرق و مغرب کے درمیان کی ہر مخلوق اس کی چیخ سنتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے آگ کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور آگ کا بستر بچھا دیا جاتا ہے۔ اس حدیث میں قبر کے عذاب‘ برزخ کے عذاب اور ہتھوڑوں کا ذکر ہے۔ سورۃ الحج کی آیات ۱۹ تا ۲۲ میں بھی جہنّم کے ہتھوڑوں کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ معاملہ ختم نہیں ہوگا بلکہ دوبارہ بحال کیا جائے گا اور مستقل عذاب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قبر و جہنّم کے عذاب سے محفوظ رکھے!

کبھی تنہائی میں سوچیں کہ ہمیں قبر کی کتنی فکر ہے! قبر کی سختی سے بچنے کی کس قدر فکر ہے؟ جنّت کے حصول کے لیے ہم کس قدر فکر مند ہیں؟ جہنّم سے بچنے کے لیے ہم کس قدر فکر مند ہیں؟ میری اور آپ کی ٹینشن میں یہ فکر شامل ہے کہ ہم قبر کے عذاب سے بچ جائیں؟ ہمیں تو بس اپنی تنخواہ کی فکر ہوتی ہے‘ کاروبار میں منافع کی فکر ہوتی ہے‘ سرمایہ کاری کی فکر ہوتی ہے۔ اس بارے

میں ہم ذرا بھی متردّد نہیں ہیں کہ قبر کے عذاب سے بچ جائیں‘ جہنّم کے عذاب سے بچ جائیں‘ جنّت ہمیں مل جائے‘ اللہ کی رضا ہمیں مل جائے‘ اللہ کا دیدار ہمیں حاصل ہو جائے۔ یہ حقیقت میں ہمارے سب سے بڑے مسئلے ہیں۔ یہ سب سے بڑے حالات ہیں جو پیش آنے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’لوگو تم آج سو رہے ہو‘ جب موت آئے گی تب تم جاگو گے۔‘‘

That would be the begining of time, not the end of time.

آج جمعہ کا دن ہے‘ مبارک موقع بھی ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر سوچیے گا: کیا آپ مرنے کو تیار ہیں؟ آپ کے تیار نہ ہونے سے کیا عزرائیلؑ رک جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے اجل کو موخر نہیں کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ﴾ (المنٰفقون:۱۱)

’’اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا‘ کسی جان کو جب اُس کا وقت معیّن آپہنچے گا۔‘‘

کیا ہم تیار ہیں مرنے کو؟ قبر کا عذاب ہمیں رلاتا ہے؟ ایک دن میری اور آپ کی ماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ’’عائشہ کیوں روتی ہو؟‘‘ کہنے لگیں: ’’جہنّم کے عذاب نے مجھے رلا دیا۔‘‘ اُمّ المؤمنین کو اس پر کبھی رونا نہیں آیا کہ ایک ہی جوڑے میں گزارا ہوتا تھا‘ گھر چھوٹا تھا‘ دو دو مہینے چولہا نہیں جلتا تھا۔

﴿وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ﴾ (الحشر:۱۸)

’’چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا تیاری کی ہے۔‘‘

آج جب کہ مہلت ہے‘ اللہ تعالیٰ ہمیں کل کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِّ العالمین!!

❀❀❀

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

مشرقِ وسطیٰ کی پھیلتی جنگ اور ہمارے مسائل

ایوب بیگ مرزا

عالمی جنگجو ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس دنیا کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں اور یہ عمل اب اتنی تیز رفتاری سے جاری ہے کہ نئے نئے محاذ کھل رہے ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے جنگ اب مشرقِ وسطیٰ کی حدود پھلانگتی نظر آ رہی ہے۔ پھر یہ کہ اسلحہ اور بارود تو ۲۸ فروری ۲۰۲۶ء سے ہی اس میں جھونکا جا رہا ہے۔ آبنائے ہرمز کے بند ہونے سے تیل کا بحران پیدا ہوا تو عالمی اقتصادی اور مالیاتی معاملات بھی متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اب تک یہ دنیا کی اقتصادیات کو بالواسطہ متاثر کر رہی تھی۔ امریکہ کی طرف سے ایران پر وسیع اور سخت ترین پابندیاں عائد کرنے سے اب اقتصادی طور پر دنیا اس سے براہ راست اور بلاواسطہ متاثر ہو رہی ہے۔ گویا تیر و تفنگ کے ساتھ تجوریوں کو بھی سیاسی اور عسکری طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ لہٰذا اب صرف مشرق وسطیٰ یا ایشیا کے لوگ ہی نہیں بلکہ دنیا کا ہر ملک اور ہر شہری اس جنگ سے متاثر ہوگا۔ مثال کے طور پر چین دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جو کسی صورت میں جنگ کی چنگاری کو اپنے دامن پر گرنے نہیں دیتا، لیکن ایران پر اتنی سخت اقتصادی پابندیاں عائد ہونے پر وہ بھی چیخ اُٹھا ہے۔ گویا اب دنیا میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا اس جنگ سے کیا تعلق! کوئی بلاواسطہ ملوث ہے اور کوئی بالواسطہ متاثر ہے۔

۲۸ فروری کو اس جنگ کا آغاز ہوا تو عاجز نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک طویل اور تھکا دینے والی جنگ ہوگی، تاہم خیال یہی تھا کہ بہرحال ایک محدود جنگ ہوگی، لیکن اب یہ جنگ خوف ناک حد تک پھیلتی نظر آتی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ یہ عالمی جنگ بن جائے! حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے یہ جنگ اسرائیل کے ایماء، ترغیب بلکہ دباؤ پر شروع کی تھی۔ یہ کوئی اندازہ یا تبصرہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اب امریکی بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں۔ بہرحال اب امریکہ اپنی چودھراہٹ سمیت اس میں بری طرح پھنس چکا ہے۔ یعنی یہ جنگ امریکہ کے لیے ایسی دلدل بن گئی ہے کہ جتنا زیادہ وہ اس میں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی پھنستا چلا جا رہا ہے۔ یہ

اسرائیل کی چال کا کمال ہے یا پھر امریکہ کی اس آوارگی کا نتیجہ جو وہ سپر پاور بنتے ہی کرتا چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر سوویت یونین کو کامیابی سے شکست و ریخت سے دوچار کرنے کے بعد اس نے دنیا میں اپنی قوت کے اظہار کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ مثال کے طور پر چند ماہ پہلے وینزویلا کے صدر کو گرفتار کر کے اپنے ملک میں قید کر دینا دہشت گردی جیسا ایک عمل تھا جو بلاجھجک کیا گیا۔ اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جنگ کا زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ اس کے مفاد میں ہے‘ اس لیے کہ اسے اپنی سرحدوں کو وسیع کرنا ہے جو ظاہر ہے پُرامن طریقے سے تو ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جغرافیائی حدود کو تو صرف تلوار کے زور پر بڑھایا جاتا رہا ہے اور بڑھایا جا سکے گا۔ کون آسانی سے یا مذاکرات کے ذریعے اپنی حدود میں داخل ہونے دیتا ہے! لہٰذا گزشتہ چھ ماہ میں اس نے جنگ بندی کے حوالے سے ہر قسم کے مذاکرات کو سبوتاژ کیا تاکہ گریٹر اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے۔ علاوہ ازیں جب ایران کی طرف سے خلیج میں امریکی اڈوں پر حملے رکتے یا کم ہوتے تو اسرائیل یہ کمی پوری کر دیتا جبکہ الزام ایران پر آ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نے ایک ہدف طے کیا ہوا ہے جس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ نہ کسی عالمی قانون کی پروا کرتا ہے‘ نہ حلیف اور حریف میں فرق رکھتا ہے۔ ایک پختہ رائے یہ ہے کہ ایران کو ملیا میٹ کرنے کے لیے اسرائیل امریکہ کو استعمال کرے گا‘ پھر امریکہ سے نمٹے گا‘ اس لیے کہ اسے عالمی قوت کے مرکز کو واشنگٹن سے تل ابیب یا یروشلم منتقل کرنا ہے۔ گویا اسے جنگ کو نہ صرف جاری رکھنا ہے بلکہ پھیلانا بھی ہے تاکہ ایک فریق تباہ و برباد ہو اور دوسرا فریق کمزور پڑے۔ راقم نہیں جانتا کہ وہ ایسا کر سکے گا یا نہیں! گریٹر اسرائیل کا قیام جو اسرائیل کا اصل ہدف ہے‘ وہ اسے چھپاتا نہیں۔ شنید یہ ہے کہ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی عمارت کے ماتھے پر یہ تحریر کندہ ہے: ’’اسرائیل! تیری سرحدیں دجلہ اور فرات تک ہیں۔‘‘ یہودی اس کا تاریخی بیک گراؤنڈ یہ بتاتے ہیں کہ انہیں ماضی بعید میں ان علاقوں سے بزورِ قوت نکالا گیا تھا۔ جو صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے اس کی روشنی میں وہ گریٹر اسرائیل کا ہدف حاصل کرتا ضرور نظر آ رہا ہے۔ جنگ کی موجودہ صورتِ حال دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صہیونیوں کی خواہشات حقیقت کا روپ دھار رہی ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ باہم گتھم گتھا ہیں بلکہ اب تو ان کے درمیان گھمسان کا رَن پڑ چکا ہے۔ یمن کی تنظیم ’’انصار اللہ‘‘ کو حوثی کہا جاتا ہے‘ جس کے بارے میں یہ رائے ہے کہ وہ ایران کی پراکسی ہے یا کم از کم اتحادی ہے‘ اس نے سعودی عرب

پر حملہ کر کے وہاں بہت سے باشندوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ جواب میں سعودی فضائیہ نے حوثیوں کے اڈوں پر شدید بمباری کی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ ایران جنگ نے رخ بدل لیا ہے۔ یہ مسلمان دشمن عناصر کی عیاری جبکہ مسلمانوں کی انا پرستی اور حماقت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان باہم خون ریزی پر اتر آئے ہیں۔ جنگ کی صورت حال سمجھنے اور علاقے میں حالات کیا رخ اختیار کر رہے ہیں اس کا جائزہ لینے کے لیے یمن میں حکومت اور باغیوں کے درمیان معاملات کو سمجھنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ اور عالمی سطح پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

یمن میں قائم حکومت کو سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے جبکہ باغیوں کو ایران کی پشت پناہی۔ چھوٹی بڑی جھڑپیں ایک عرصے سے جاری ہیں' لیکن سعودی عرب کا حوثیوں پر فضائی حملہ یہ فریقین کے درمیان اب تک کی شدید ترین جنگ ہے۔ اس لڑائی سے پہلے یمن میں کون سے علاقے پر حکومت اور کون سے علاقوں پر باغیوں کا کنٹرول تھا' اس کی وضاحت سے ہم دیکھیں گے کہ جنگ کے نتیجے میں کون آگے بڑھ رہا ہے اور کون پسپا ہو رہا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بین الاقوامی سطح پر یمن کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا کنٹرول ملک کے جنوبی اور مشرقی حصوں کے چند اہم علاقوں پر ہے۔ حکومت کا دارالحکومت عدن ہے اور یہی انتظامی مرکز ہے۔ جنوبی علاقہ میں حکومتی فورسز اور اتحادی موجود ہیں۔ صوبہ مارب میں تیل اور گیس کے ذخائر ہیں' یہ بھی حکومت کے زیر اثر ہیں۔ صوبہ شبوا اور حضرموت یمن کے مشرقی اور وسطی اضلاع ہیں جہاں حکومتی اثر و رسوخ ہے۔ علاوہ ازیں لحج' ابین اور المیرہ کے اضلاع بھی حکومتی کنٹرول میں ہیں۔ ''انصار اللہ'' زیادہ تر ملک کے شمالی' مغربی اور وسطی پہاڑی علاقوں پر قابض ہیں۔ صنعاء دارالحکومت اور انتظامی و سیاسی مرکز ہے۔ باغیوں کے زیر کنٹرول الحدیدہ بحیرۂ احمر پر واقع انتہائی اہم ساحلی اور بندرگاہی شہر ہے۔ گنجان آباد وسطی صوبہ پر بھی اب حوثیوں کو کنٹرول حاصل ہے۔ حوثی انتظامیہ ان علاقوں پر کنٹرول رکھنے کی وجہ سے یمن کی غالب آبادی اور بحیرۂ احمر کی ساری پٹی کے اہم حصوں پر عمل داری رکھتی ہے۔ صورتِ حال میں ایک حیران کن تبدیلی یہ آئی ہے کہ حوثیوں کی کارکردگی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ یمن میں سرکاری حکام نے اعتراف کیا ہے کہ حوثیوں نے باب المندب کے یمنی حصے پر قبضہ کر لیا ہے جو بحیرۂ احمر اور نہر سویز کا جنوبی دروازہ ہے۔ حکومتی سطح پر یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ مغربی ساحل پر جو کچھ بھی ان کے کنٹرول میں تھا وہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باب المندب پر حوثیوں کا مکمل

کنٹرول نہیں ہوا‘ البتہ وہ اس طرف برابر بڑھ رہے ہیں۔ ادھر غیر متوقع طور پر سعودی عرب کی ایسٹ ویسٹ پائپ لائن پر عراق سے حملہ ہوا ہے جس سے پائپ لائن کو شدید نقصان پہنچا اور وہاں سے تیل کی سپلائی بند ہوگئی ہے۔ عراق کا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں حکومت امریکہ کی مسلط شدہ ہے لیکن بہت سے عوام اور غیر ریاستی عناصر کو ایران کی حمایت حاصل ہے۔ عراق کی حکومت نے اس پر ایکشن لیا اور اپنے ایک اعلیٰ فوجی عہدے دار کو معطل کر دیا ہے۔ اگر حوثیوں کو باب المندب پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے تو سعودی عرب کے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

اب یہاں سمجھنے والی بات یہ ہے کہ حوثی یکدم اتنے برق رفتار کیسے ہو گئے! حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور اس کی بنیاد پر عسکریت اتنی ظالم شے ہے کہ مفادات حاصل کرنے کے لیے دشمنوں کی بھی مدد کی جاتی ہے۔ مصدقہ اطلاعات ہیں کہ اسرائیل نے اس حوالے سے حوثیوں کی مدد کی ہے‘ حالانکہ وہ اس کے دشمن ایران کے اتحادی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسرائیل اتنا بڑا اقدام امریکہ کی رضامندی کے بغیر نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ولی عہد محمد بن سلمان نے امریکی صدر ٹرمپ کو ایک دن میں دو مرتبہ رابطہ کیا اور حوثیوں کے خلاف مدد کے لیے پکارا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ حوثیوں کی مدد کرنا اسرائیل کا ایک بہت بڑا ٹریپ ہے جو اُس نے پاکستان اور شاید ترکیہ کو بھی پھانسنے کے لیے بچھایا ہے۔ وہ یوں کہ جب حوثیوں کو اتنی زیادہ قوت و پشت پناہی فراہم کر دی جائے گی تو وہ نہ صرف یمن کی سعودی حمایت یافتہ حکومت کو پچھاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ سعودی عرب پر بھی حملہ آور ہوں گے۔ لہٰذا وہ سعودی عرب پر مسلسل حملے کر رہے ہیں۔ اگر حوثی باب المندب پر مکمل قبضہ کر لیتے ہیں تو سعودی عرب کی تیل کی برآمد کے دونوں ذرائع (آبنائے ہرمز اور باب المندب) بند ہو جائیں گے۔ حوثیوں نے یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ ہماری دشمنی صرف ایک ملک یعنی سعودی عرب سے ہے۔ اگر سعودی عرب کے تیل کی برآمد بند ہوگئی تو ان کے پاس صحرا کے سوا کچھ نہ رہے گا۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ سعودی عرب ایک ہمالیائی غلطی کر چکا ہے‘ وہ یہ کہ حوثیوں کا ایک وفد خامنہ ای کے جنازے میں شرکت کر کے واپس آیا تو صنعاء کے ہوائی اڈے پر سعودی عرب نے بمباری کر دی۔ حوثیوں کا وفد بچ گیا لیکن حوثیوں نے اعلان کیا کہ وہ اس کا بدلہ لیں گے۔ حوثی اس حملہ کی وجہ سے بڑے مشتعل ہوئے اور اب وہ پوری قوت سے حملہ آور ہوئے ہیں۔

ابھی تک کی اطلاعات کے مطابق سعودی عرب خود ہی حوثیوں کے حملوں سے نمٹ رہا تھا‘

صرف صدر ٹرمپ سے مدد مانگی گئی تھی جس نے صاف انکار کر دیا۔ اگر سعودی عرب کو محسوس ہوا کہ اقتصادی لحاظ سے اس کی گردن حوثیوں نے دبوچ لی ہے اور وہ اپنے بازوؤں پر یہ قبضہ نہیں چھڑوا سکتا‘ تو پھر وہ ’’مکہ دفاعی معاہدے‘‘ کے حلیفوں یعنی پاکستان اور ترکی کو پکارے گا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ راقم نے ان سطور میں اس معاہدے کو پاکستان کے مفاد کے خلاف قرار دیا تھا‘ لیکن جوشیلے لوگوں نے اس مخالفت کو کفر کے مترادف قرار دیا تھا۔ راقم نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ یہ پاکستان کو اس جنگ میں ملوث کرنے کی ایک سازش ہے۔ اب جو صورتِ حال سامنے آ رہی ہے‘ اس کے مطابق اگر ہم سعودی عرب کی پکار پر لبیک نہیں کہتے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ سعودی عرب کا پاکستان سے ناراض ہونا کسی عام ملک کا ناراض ہونا نہیں ہے۔ ہماری دال روٹی سعودیہ کی مدد سے ہی چل رہی ہے۔ اُس نے ہمارے خزانے میں آٹھ ارب ڈالر رکھوائے ہوئے ہیں تاکہ پاکستان اقتصادی طور پر اپنے آپ کو گھسیٹتا چلا جائے۔ خزانے میں اتنی رقم کا ہونا آئی ایم ایف کی شرط بھی ہے۔ اگر سعودی عرب ناراض ہو کر یہ رقم نکال لے تو ہمارا کیا بنے گا! دوسری طرف اگر ہم جذباتی فیصلے کرتے ہوئے سعودی عرب کی پکار پر حوثیوں کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑتے ہیں تو اس کے نقصانات سوچ کر بھی راقم لرز اٹھتا ہے۔ ایک طرف ایران ہے‘ جو مسلمان ہونے کے ساتھ ہمارا ہمسایہ بھی ہے۔ پہلے ہی صوبہ بلوچستان میں دہشت گردی کی کارروائیاں ہمیں چین نہیں لینے دے رہیں۔ ایران کے اتحادیوں سے جنگ کی صورت میں وہ بلوچستان میں کیا کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس سے بڑی اور اہم تر بات یہ ہے کہ پاکستان میں اہلِ تشیع بہت بڑی تعداد میں ہیں‘ جن کی ایران کے ساتھ زبردست ہمدردیاں ہیں۔ ہمارے سِول اور ریاستی اداروں میں بھی اہل تشیع کی ایک بڑی تعداد اہم پوسٹوں پر موجود ہے۔ لہٰذا ریاست کو ایک اور بڑے مسئلہ کا سامنا ہوگا۔

اس بگڑنے والی صورتِ حال کو پاکستان کیسے سنبھالے گا؟ دشمن کو اس ساری صورتِ حال کا اندازہ تھا‘ اسی لیے صدر ٹرمپ نے دفاعی معاہدے پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ ٹریپ کامیاب رہا ہے۔ ترکیہ کو بہت سی وجوہات کی بنا پر لڑائی کا رخ بدلنے یعنی سعودی عرب اور حوثیوں کے یوں آمنے سامنے آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ایک تو وہاں اتنی بڑی تعداد میں اہلِ تشیع نہیں ہیں‘ نہ حکومت اور ریاستی اداروں میں ان کا اتنا اثر و رسوخ ہے‘ نہ سعودی عرب اور ترکیہ کے تعلقات اتنے مثالی تھے‘ نہ مالی معاملات میں وہ سعودی عرب کے اتنے محتاج ہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔

البتہ پاکستان کے لیے معاملہ انتہائی خطرناک ہو چکا ہے۔ اپنی اقتصادی صورت حال کی وجہ سے وہ نہ سعودی عرب کو ناراض کر سکتا ہے اور نہ اپنے ہمسائے ایران کو' جو عسکری طور پر بھی علاقے میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ ایسے میں ہم کسی طرح بھی جنگ سے پہلوتہی نہیں کر سکیں گے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے کہ پاکستان کو جال میں پھنسانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اس کا موجودہ صورتِ حال سے کیا تعلق ہے' تاریخ کے کچھ اوراق پلٹنے پڑیں گے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کو مکمل شکست ہوئی اور اسرائیل فتح یاب ہوا۔ اسرائیل نے عربوں کے بہت سے علاقے ہتھیا لیے۔ جمال عبدالناصر جو خود اپنے اور مصریوں کے بارے میں بڑے تکبر سے کہتا تھا: We are the sons of Firaun۔ گویا وہ بدبخت اپنا تعلق اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن فرعون کے ساتھ بڑے فخر سے جوڑتا تھا' بری طرح شکست کھا گیا۔ دکھاوے کے لیے صدارت سے ایک نمائشی استعفاء دے دیا جو جلد واپس بھی لے لیا۔ اسرائیل نے اس فتح کا جشن فرانس کے شہر پیرس میں بڑے زوردار انداز میں منایا۔ اس تقریب میں اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان کی تقریر ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیل پاکستان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ ان عربوں کو شکست دینا تو کوئی مسئلہ نہیں' ہمارے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں' ہمارا اصل دشمن اور اصل مقابلہ پاکستان سے ہوگا۔ یاد رہے کہ اُس وقت تک پاکستان نے ایٹمی صلاحیت بھی حاصل نہیں کی تھی' لیکن پاکستانی فوج کے پیشہ ورانہ معیار اور اس کے جوانوں کی بے پناہ بہادری کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اب اللہ کی مدد اور رحمت سے پاکستان ایک ایٹمی قوت بن چکا ہے' تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسرائیل موجودہ جنگ کا دائرہ وسیع کر کے پاکستان کو کیوں ملوث کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اسرائیل حوثیوں کی مدد کر کے اور ان سے سعودی عرب پر حملے کروا کر پاکستان کو جنگ میں گھسیٹ لینا چاہتا ہے۔ اسی لیے مکہ دفاعی معاہدے پر امریکہ نے خوشی کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خواہی نخواہی اس جنگ میں ملوث ہوگا اور ہم اس کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ آور ہو سکیں گے۔ اگرچہ اللہ کی ذات بچانے والی ہے' اس نے اگر ناموافق حالات میں پاکستان کو ایٹمی قوت بنا دیا تھا تو وہ اس کو بچا لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے' لیکن ہم کو سوچ سمجھ کر صرف قومی اور اُمّتِ مُسلمہ کے مفاد میں پالیسی بنانا چاہیے۔ صرف جذبات اور ڈالروں کے لالچ میں کسی معاہدے

میں خود کو جکڑ لینا دانش مندی نہیں ہے۔

ظاہری طور پر مکہ دفاعی معاہدے کے مطابق تو پاکستان اور ترکیہ کو آگے بڑھ کر حوثیوں پر حملہ آور ہونا چاہیے‘ اور یہ شاید سعودی عرب کی خواہش بھی ہو۔ البتہ پاکستان حوثیوں کے حملوں کی مذمت کر رہا ہے اور اس حوالے سے وزارتِ خارجہ کے ترجمان ہی نہیں‘ خود وزیراعظم بھی حوثیوں کو تنبیہہ جاری کر چکے ہیں لیکن حوثیوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ سوشل میڈیا پر اس حوالے سے جب زیادہ چرچا ہوا اور حکومت سے پوچھا گیا تو وزارتِ خارجہ کے ترجمان نے باقاعدہ وضاحت کی کہ مکہ دفاعی معاہدہ ریاست کا ریاست کے ساتھ معاہدہ ہے‘ اگر غیر ریاستی عناصر معاہدے کے کسی فریق سے جنگ کریں گے تو دوسرے ممالک ملوث نہیں ہوں گے۔ جیسے پاکستان ٹی ٹی پی اور بی ایل اے جیسے غیر ریاستی عناصر سے خود جنگ کر رہا ہے اور معاہدے کے کسی دوسرے ملک سے مدد کا طالب نہیں‘ اسی طرح حوثی غیر ریاستی عناصر ہیں جن سے سعودی عرب خود نمٹے گا۔ بہرحال حوثیوں نے امریکہ‘ اسرائیل‘ ایران جنگ کا رخ کافی حد تک موڑ دیا ہے۔ پاکستان کو اس جنگ میں گھسیٹنے کے لیے اسرائیل ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ مختلف ذرائع سے پاکستان نے یہ عندیہ دیا ہے کہ اگر حوثی سعودی عرب جنگ سے حرمین شریفین کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو پاکستان جنگ میں لازماً کود جائے گا۔ لہٰذا حال ہی میں مکہ مکرمہ پر ایک ڈرون حملہ کیا گیا۔ حوثیوں نے بڑی شدت سے اس کی تردید کی کہ یہ ڈرون اُن کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ معلوم ہوتا ہے بلکہ کافی حد تک یقینی دکھائی دیتا ہے کہ یہ جعل سازی اسرائیل کر رہا ہے۔ ایک تو اس سے مسلمان حوثیوں کے خلاف ہوں گے‘ دوسرا پاکستان کو اس جنگ میں ملوث ہونا پڑے گا۔ اسرائیل اسے مسلمانوں کی باہم جنگ بنانے میں ہر حربہ اختیار کر رہا ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہا ہے۔

یہاں ایک بڑا اہم نکتہ قابلِ غور ہے کہ حوثی ایران کے اتحادی ہیں بلکہ انہیں ایران کی پراکسی بھی کہا جاتا ہے‘ لیکن اس وقت ایران کا بدترین دشمن اسرائیل حوثیوں کی مدد کر رہا ہے۔ امریکہ نے بھی حوثیوں کے خلاف سعودی عرب کی کسی عملی مدد سے انکار کر دیا ہے۔ حقیقت میں امریکہ اور اسرائیل چاہتے ہیں کہ حوثیوں کی مدد سے وہ دو طرح کے فائدے حاصل کریں۔ اگر حوثیوں کی وجہ سے سعودی عرب اتنا مجبور ہو جائے کہ امریکہ سے مدد کی درخواست کرے‘ تو وہ مستقبل کے حوالے سے سعودی عرب سے کچھ غیر معقول شرائط تسلیم کروائیں۔ مثلاً سعودی عرب

سے ابراہام اکارڈ تسلیم کرنے کی شرط رکھی جا سکتی ہے یعنی اسرائیل کو تسلیم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ پاکستان اور ترکیہ میدان میں اتریں تاکہ وہ خاص طور پر پاکستان سے دو دو ہاتھ کر سکیں‘ اس لیے بھی کہ وہ کبھی کسی اسلامی ملک کو ایٹمی طاقت کے طور پر برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ساری جنگ نے اب یہ رخ اختیار کر لیا ہے۔

جنگ کی موجودہ صورتِ حال عالمی سطح پر تیل کا بہت بڑا بحران پیدا کر دے گی۔ تیل کی رسد متاثر ہو چکی ہے لیکن معاملہ اس لحاظ سے بدترین سطح پر جا سکتا ہے جس سے تیل کی قیمتیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کس حد تک بڑھ جائیں گی اور عالمی تجارت کس حد تک متاثر ہو گی! پاکستان جیسا غریب اور مقروض ملک جو پہلے ہی اقتصادی لحاظ سے انتہائی بُری حالت میں ہے‘ اس کی تو بقا کا مسئلہ بن سکتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کے حالات کا تعلق ہے‘ یہاں چار سال سے ایک ایسا نظام کارفرما ہے جس کے اسٹیک ہولڈرز اور اس سے مستفید ہونے والے (یہاں تک کہ وفاقی کابینہ کے وزراء بھی) اسے ایک ہائبرڈ نظام کہتے ہیں۔ فوج کی سرپرستی میں ایک انتہائی غیر مقبول اور لاغر سیاسی جماعت کی حکومت قائم ہے جو تمام سیاسی و معاشی اور خارجی معاملات میں غیر مؤثر ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف حکومتی وسائل سے لطف اندوز ہوتی ہے اور اس کی توجہ صرف اپنے ذاتی حالات کو بہتر کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ اس کے سرپرست اب تک یہ سب کچھ اس لیے برداشت کر رہے تھے کہ انہیں دنیا سے ڈیل کرنے کے لیے ایک نمائشی حکومتی سیٹ اَپ کی ضرورت تھی‘ لیکن حالات و واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ سرپرست ان کی بدعنوانی اور نااہلی سے بالکل تنگ آ چکے ہیں‘ لہٰذا اس طرح کی خبریں گرم ہیں کہ وہ اس حکومت کو کسی وقت بھی چلتا کریں گے۔ اسٹیبلشمنٹ کو بھی اصل مسئلہ یہ درپیش ہے کہ جس شخصیت پر وہ سیاسی لحاظ سے قلم پھیر چکے ہیں (یعنی عمران خان)‘ اس کو کسی بھی صورت میں اقتدار میں واپس نہیں آنے دینا۔ اس کی جماعت تحریکِ انصاف دن بہ دن عوامی حمایت حاصل کرتی جا رہی ہے‘ کیونکہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ ۸ فروری کے انتخابات میں سخت پابندیوں اور کوئی انتخابی نشان الاٹ نہ ہونے کے باوجود اس نے شاندار کامیابی سمیٹی تھی لیکن فارم ۴۷ کو استعمال کرتے ہوئے اسے حکومت نہیں بنانے دی گئی۔ البتہ اس کی جماعت کے پی کے میں حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ اب کے پی کے کی حکومت اور وفاقی حکومت میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ کے پی کے کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے کئی حربے اختیار کیے گئے لیکن ناکام رہے۔ عمران خان پر ۳۰۰ کے قریب

مقدمات قائم کر دیے گئے تاکہ وہ سرنڈر کر کے خود میدان چھوڑ جائے‘ لیکن وہ تمام تر تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے مقتدرہ کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔ یوں دوسرے صوبوں میں بھی اس کی حمایت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ پھر یہ کہ نمائشی حکومت کی بدعنوانیوں اور نااہلی نے بھی اسٹیبلشمنٹ کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔

اس صورتِ حال کے تناظر میں مشرقِ وسطیٰ کی جنگ نے پاکستان کے مسائل کو بھی بہت گمبھیر بنا دیا ہے‘ جس سے ملک میں سیاسی کیفیت بھی بہت غیر یقینی ہو چکی ہے۔ معاشی حالات تو اس قدر دگرگوں ہیں کہ آئی ایم ایف مکمل طور پر پاکستان کی داخلی‘ معاشی ہی نہیں بلکہ خارجی پالیسیوں کو بھی کنٹرول کر رہا ہے۔ لہٰذا اسٹیبلشمنٹ اب مجبور ہوئی ہے کہ وہ تحریکِ انصاف کے چیئرمین عمران خان سے رابطہ کرے اور مذاکرات کے ذریعے کچھ لے دے کر ملک کو جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات اور پاکستان کی سیکورٹی کے حوالے سے کوئی جامع پالیسی بنائی جا سکے۔

شنید یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ عمران خان کو مکمل ریلیف اور رہائی دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ عمران خان آئندہ انتخابات تک خاموشی سے بیٹھا رہے اور ریاست کو کوئی مسئلہ نہ ڈالے۔ جبکہ عمران خان اگر یہ بات قبول کر لے تو وہ قریباً چار سال سے جو قید بامشقت کاٹ رہا ہے وہ محنت اور مشقت ضائع ہو جائے گی‘ لہٰذا مذاکرات بار بار ناکام ہو رہے ہیں۔ لیکن ریاست کو بھی پہاڑ جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ تحریک انصاف ۲۷ ستمبر کو اسلام آباد آ کر سارے ملک کے نظام کو مفلوج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اسے اسلام آباد ہائی کورٹ نے مارچ کی مشروط اجازت بھی دے دی ہے۔ ریاست کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ جماعت اسلامی بھی ۲۰ ستمبر کو اسلام آباد میں ڈیرے ڈالنے آ رہی ہے۔ جماعت کا مطالبہ ہے کہ پٹرول پر سے لیوی ختم کریں۔ ریاست کے اگرچہ جماعت اسلامی سے بڑے اچھے تعلقات ہیں جس نے ملک کے کئی مقامات پر دھرنے دیے ہیں لیکن ریاست لیوی ختم نہیں کر سکتی کیونکہ محصولات کا وہ ٹارگٹ پورا کرنا ہے جو اسے آئی ایم ایف نے دیا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ۲۵ ستمبر کو کسانوں نے بھی اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے کی دھمکی دے رکھی ہے۔ لیکن ریاست کو اصل خطرہ پی ٹی آئی کے ۲۷ ستمبر کے دھرنے سے ہے کیونکہ پی ٹی آئی اور خاص طور پر قیدی ۸۰۴ یعنی عمران خان جو تحریک انصاف کا سربراہ ہے اس کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ایک طرف ریاست نے اس پر اور اس

کی سیاست پر کراس لگا رکھا ہے تو دوسری طرف عوام کی اکثریت نے بھی اس کی رہائی کو اپنی ضد بنالیا ہے۔ سیاسی تجزیہ اور ماضی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اگر کوئی سیاسی شخصیت اور اس کی جماعت ملک میں انتہائی پاپولر ہو جائے تو اس کا اول تو راستہ روکا نہیں جاسکتا لیکن اگر جبر اور قوت کی بنا پر روکا جائے تو اس کے نتائج بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کی جماعت عوامی لیگ کا راستہ روک کر پہلے ہی ہم خمیازہ بھگت چکے ہیں۔ خاکسار دعا گو ہے کہ ملک کے بڑے کسی صورت اختلافات کو انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ طاقت اور سیاست دونوں ضد کی بجائے ملکی مفاد کا سوچیں۔ خاص طور پر موجودہ جنگوں کے تناظر میں کہ دنیا مکمل طور پر بدلنے جا رہی ہے۔ اس میں اگر ہم نے حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ فہمی نہ کی تو نقصان سب کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ذاتیات سے بالاتر ہو کر ملک وقوم کا سوچیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

اگر موجودہ عالمی نظام بھی اسی طرح طاقتور کے مفاد‘ کمزور کی بے بسی اور قانون کے دوہرے معیار کا شکار رہا تو تاریخ ایک مرتبہ پھر کسی نئے عالمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کرے گی۔ فرق یہ ہوگا کہ پہلے جنگوں کو روکنے کے لیے عالمی ادارہ بنایا گیا تھا اور اب جنگوں سے بچنے کے لیے کوئی نیا عالمی نظام بنانا پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ تاریخ ہمیں اس مقام تک لے جائے‘ مسلم دنیا کو اپنا راستہ خود متعین کرنا ہوگا۔

حرمین شریفین کی حفاظت ہو‘ فلسطین کا مسئلہ ہو‘ مسلم ممالک کی علاقائی سالمیت ہو یا عالمی سطح پر مسلمانوں کے سیاسی و معاشی مفادات کا تحفظ‘ ان سب کے لیے اجتماعی قوت درکار ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ مسلم ممالک ایک دوسرے کی طاقت بنیں۔ اپنی صفیں درست کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے فیصلے دوسروں کی ترجیحات کے مطابق نہیں بلکہ اپنے اجتماعی مفاد‘ عدل اور امن کے اصولوں کے مطابق کریں۔ دنیا کی بڑی طاقتیں اگر اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے متحد ہو سکتی ہیں تو مسلم دنیا اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے کیوں متحد نہیں ہوسکتی؟ یہ سوال آج اقوام متحدہ کے خالی ہال میں موجود خالی کرسیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے!

❁❁❁

میثاقِ مکّہ سے میثاقِ اُمّت تک

ڈاکٹر ضمیر اختر خان ☆

اس تحریر میں میثاقِ مکّہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر ''میثاقِ اُمّت'' کی طرف جانے کا ایک فکری و عملی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں پاکستان کے کردار کو محض ایک مسلم ملک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسلامی نظریے پر قائم ریاست اور اُمّتِ مُسلمہ کے اتحاد کے ممکنہ محرک کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں تین مرکزی تصورات باہم مربوط ہوں گے: میثاقِ مکّہ' میثاقِ اُمّت' پاکستان کا تاریخی و نظریاتی کردار۔

دنیا آج جس بحران سے گزر رہی ہے' وہ محض سیاسی' معاشی یا عسکری نوعیت کا نہیں۔ یہ دراصل انسانی تہذیب کے مقصد' اقدار اور مستقبل کا بحران ہے۔ جنگیں ختم نہیں ہو رہیں' نفرتیں بڑھ رہی ہیں' طاقتور کمزوروں کو روند رہے ہیں' قومیں اپنے مفادات کے حصار میں قید ہیں اور انسان اپنی بے پناہ مادی ترقی کے باوجود امن' عدل اور حقیقی اطمینان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ایسے عالم میں اسلام کے پاس دنیا کو دینے کے لیے صرف ایک مذہبی دعوت نہیں بلکہ ایک مکمل عالمی تصورِ حیات موجود ہے۔ وہ ہے: اللہ کی بندگی' انسان کی تکریم' عدل کا قیام' ظلم کا خاتمہ' اخلاقی ذمہ داری' پوری انسانیت کو ایک خالق کے بندوں کی حیثیت سے جوڑنے کا پیغام اور دنیا سے آخرت تک پہنچنے کا مکمل صراطِ مستقیم۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میثاقِ مکّہ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ البتہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ میثاقِ مکّہ کے تصور کو ایک وسیع تر عملی اور سیاسی وژن میں تبدیل کیا جائے۔ اس کا اگلا مرحلہ ''میثاقِ اُمّت'' ہونا چاہیے۔

میثاقِ مکّہ کا پیغام یہ ہونا چاہیے کہ اسلام دنیا کے سامنے تصادم نہیں بلکہ عدل پر مبنی امن کا تصور پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کا واضح اعلان ہے:

☆ای میل: zamirakhtarkhan@yahoo.com

﴿لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ ﴾ (البقرة:٢٥٦)

''دین میں کوئی جبر نہیں۔''

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اسلام انسان کو ایمان کی دعوت ضرور دیتا ہے‘ لیکن کسی فرد یا قوم کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ ایمان وہی معتبر ہے جو شعور‘ اختیار اور رضامندی سے اختیار کیا جائے۔ اسی لیے اسلام انفرادی مذہبی آزادی اور انسانی وقار کا احترام کرتے ہوئے دوسروں کو جینے کا حق دیتا ہے۔

مذہبی آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ حق کو باطل کے سامنے بے اثر اور بے اختیار کر دیا جائے۔ اسلام اپنے پیغام کو محض ایک نجی عقیدہ سمجھ کر محدود نہیں کرتا بلکہ حق کے غلبے اور عدل کے قیام کا داعی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ﴾ (الإسراء:٨١) ''اور کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔'' اسلام کسی پر ایمان مسلط نہیں کرتا‘ لیکن اگر کوئی قوت ظلم‘ جبر اور طاقت کے ذریعے حق کو دبانے‘ اہلِ ایمان کو ان کے دین سے روکنے یا انسانی آزادی اور عدل کو پامال کرنے کی کوشش کرے تو اسلام اسے محض خاموشی سے برداشت کرنے کا درس بھی نہیں دیتا۔ ظلم کے سدِباب اور عدل کے قیام کے لیے قوت کا استعمال نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ بعض حالات میں ناگزیر ہو سکتا ہے۔

لہٰذا ہمیں دو اصولوں میں واضح فرق رکھنا ہوگا: ایمان کے قبول کرنے میں جبر نہیں‘ لیکن ظلم و جبر کے غلبے کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام انسان کے دل کو فتح کرنے کے لیے دعوت‘ حکمت اور کردار کا راستہ اختیار کرتا ہے؛ لیکن اگر کوئی طاقت بندگانِ خدا کو حق سننے سے روکنے‘ ظلم مسلط کرنے یا حق کو بزورِ طاقت کچلنے کی کوشش کرے تو اسے روکنا بھی عدل کا تقاضا ہے۔ یہی وہ توازن ہے جس میں دعوتِ حق‘ مذہبی آزادی‘ عدل اور قوت کے ذمہ دارانہ استعمال کے اصول باہم جمع ہو جاتے ہیں۔

میثاقِ مکّہ انسانیت کو امن اور باہمی احترام کا راستہ دکھاتا ہے؛ میثاقِ اُمّت مسلم دنیا کو اس راستے پر متحد ہو کر چلنے کا عہد دے سکتا ہے۔

اب ضرورت ہے میثاقِ اُمّت کی!

آج تقریباً ۵۷ مسلم ممالک دنیا کے نقشے پر موجود ہیں۔ ان میں بے پناہ انسانی وسائل

ہیں‘ وسیع جغرافیائی پھیلاؤ ہے‘ قدرتی دولت ہے‘ نوجوان آبادی ہے‘ تیل اور گیس کے ذخائر ہیں‘ اہم سمندری راستے ہیں‘ دُنیا کی بڑی منڈیاں ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک مشترک دینی وتہذیبی ورثہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا یہ سب مل کر ایک قوت ہیں؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جواب ابھی ''نہیں'' ہے۔

ہم سیاسی اعتبار سے بکھرے ہوئے ہیں‘ معاشی اعتبار سے ایک دوسرے سے کم جڑے ہوئے ہیں‘ دفاعی اعتبار سے مشترکہ حکمتِ عملی سے محروم ہیں اور سفارتی میدان میں اکثر انفرادی فیصلوں تک محدود رہتے ہیں۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے کہ ہم ایک اُمّت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو صرف ریاستوں کے مجموعے کے طور پر دیکھتے ہیں۔

میثاقِ اُمّت کا بنیادی مقصد یہی ہونا چاہیے کہ مسلم دنیا اپنی ریاستی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے مشترکہ مقاصد‘ مشترکہ مفادات اور مشترکہ عالمی ذمہ داریوں کے لیے ایک نئے عہد میں داخل ہو۔ یہ کسی ملک کی خودمختاری ختم کرنے یا کوئی سیاسی وحدت قائم کرنے کا منصوبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک مرحلہ وار اتحاد کا منشور ہونا چاہیے۔ اس کے کم از کم چھ بنیادی پہلو ہو سکتے ہیں:

(۱) سیاسی و سفارتی یکجہتی: مسلم ممالک اہم عالمی مسائل پر ایک دوسرے سے مشاورت کا مستقل نظام قائم کریں۔ فلسطین‘ کشمیر‘ مسلم اقلیتوں‘ جنگوں‘ انسانی بحرانوں اور عالمی امن جیسے مسائل پر مشترکہ سفارتی حکمتِ عملی تشکیل دی جائے۔

(۲) مشترکہ دفاعی تعاون: قرآن مجید کا حکم ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ﴾ (الانفال: ۶۰) ''اور ان کے مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے قوت تیار رکھو۔''

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم ممالک دفاعی صلاحیت کو صرف قومی دفاع تک محدود نہ رکھیں بلکہ ایک دوسرے کی سلامتی کو بھی اپنی اجتماعی ذمہ داری سمجھیں۔ ایک ایسا Muslim Collective Security Framework تشکیل دیا جا سکتا ہے جو جارحیت کی حوصلہ شکنی‘ دفاعی تعاون‘ انٹیلی جنس شیئرنگ‘ سائبر سکیورٹی‘ قدرتی آفات اور انسانی بحرانوں میں مشترکہ کارروائی کے لیے استعمال ہو۔

(۳) معاشی تعاون: اُمّتِ مُسلمہ کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل بہت ہیں مگر ان کا مشترکہ استعمال بہت کم ہے۔ مسلم ممالک باہمی تجارت بڑھائیں‘ سرمایہ کاری فنڈ قائم

کریں‘ توانائی کے منصوبوں میں تعاون کریں‘ زرعی پیداوار اور غذائی تحفظ کے لیے منصوبے بنائیں اور ٹیکنالوجی‘ مصنوعی ذہانت‘ طب‘ تعلیم‘ صنعت میں مشترکہ تحقیق کو فروغ دیں۔ مسلم دنیا کو صرف تیل ہی نہیں بیچنا ہوگا بلکہ علم‘ ٹیکنالوجی اور صنعت میں بھی اپنی شناخت بنانا ہوگی۔

(۴) اختلافات کا پُرامن حل: میثاقِ اُمّت کا سب سے اہم اصول یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف جنگ کو ایک ناقابلِ قبول راستہ سمجھیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ (الحجرات:۱۰)

’’مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں‘ پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو۔‘‘

اگر دو مسلم ممالک کے درمیان تنازع پیدا ہو تو باقی مسلم ممالک تماشائی نہ رہیں بلکہ مصالحانہ کردار ادا کریں۔ ایک مستقل Muslim Mediation Council قائم کی جاسکتی ہے جو مسلم ریاستوں کے باہمی تنازعات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرانے میں کردار ادا کرے۔

(۵) عالمی اَمن کا پیغام: میثاقِ اُمّت کا مقصد دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا کوئی جارحانہ منصوبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا اصل مقصد یہ اعلان ہونا چاہیے کہ: اسلام طاقت کے ذریعے دنیا کو فتح کرنے نہیں بلکہ عدل‘ اخلاق اور امن کے ذریعے انسانیت کے دل جیتنے آیا ہے۔ قرآن نبی آخر الزمان ﷺ کے بارے میں کہتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء)

’’اور ہم نے آپ (ﷺ) کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

لہٰذا اُمّت مسلمہ کو دنیا کے سامنے اپنے کردار سے ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ مسلمانوں کی متحدہ قوت کا پہلا عالمی منصوبہ امن‘ انصاف‘ انسانی وقار کا قیام اور ظلم کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

(۶) اسلام کا آفاقی پیغام: یہ میثاقِ اُمّت کا سب سے بلند مقصد ہونا چاہیے۔ مسلمان دنیا کو صرف یہ نہ بتائیں کہ ہم کون ہیں؛ بلکہ یہ بھی بتائیں کہ اسلام انسانیت کو کیا پیش کرتا ہے۔ اسلام کسی ایک نسل‘ زبان‘ خطے یا قوم کا مذہب نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اجتماعِ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ، اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ، اَلَا لَا فَضْلَ

لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا اَسْوَدَ عَلَى اَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى)) [مسند احمد:۲۳۴۸۹]

''لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ یاد رکھو! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ فام کو کسی سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کو کسی سرخ فام پر، سوائے تقویٰ کے اور کسی وجہ سے فضیلت حاصل نہیں ہے!''

بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر فضیلت حاصل ہوگی تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی۔ یہی اسلام کی آفاقیت ہے۔

دنیا میں قومیتیں ہیں، نسلیں ہیں، زبانیں ہیں، جغرافیائی سرحدیں ہیں، تہذیبی شناختیں ہیں؛ مگر اسلام ان سب سے اوپر انسان کو انسان سے جوڑنے والا ایک روحانی واخلاقی رشتہ پیش کرتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

یہ آیت دراصل انسانی وحدت کا ایک عظیم منشور ہے۔

پاکستان: میثاقِ اُمّت کا محرک کیوں؟

یہاں پاکستان کا کردار غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر مسلم ممالک کی اپنی قومی شناختیں ہیں۔ کسی کے لیے عربی قومیت اہم ہے، کسی کے لیے ترک تاریخ، کسی کے لیے فارسی تہذیب، کسی کے لیے افریقی شناخت، کسی کے لیے ملائی ثقافت اور کسی کے لیے اپنی مخصوص جغرافیائی یا تاریخی شناخت۔ یہ تمام شناختیں صرف تعارف کے لیے ہیں۔ پاکستان کے قیام کا بنیادی مقدمہ ایک اسلامی نظریے سے وابستہ تھا۔ یہ صرف زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کے قیام کے پس منظر میں برعظیم کے مسلمانوں کی یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی اسلام کی تعلیمات کے مطابق منظم کر سکیں۔ اسی لیے پاکستان کا سب سے

بڑا اثاثہ اس کا رقبہ‘ آبادی‘ ایٹمی صلاحیت یا جغرافیائی محلِ وقوع نہیں؛ پاکستان کا اصل اثاثہ اس کی نظریاتی شناخت ہے‘ جو اسے اُمّتِ مُسلمہ کے اتحاد کے لیے ایک فطری کردار عطا کرتی ہے۔

پاکستان کو ’’اُمّت کا لیڈر‘‘ نہیں بلکہ ’’امّت کا خادم‘‘ بننا ہوگا۔ یہاں ایک بنیادی احتیاط ضروری ہے۔ پاکستان کو یہ تصور نہیں اپنانا چاہیے کہ وہ باقی مسلم دنیا پر اپنی قیادت مسلّط کرے بلکہ اسے یہ کہنا چاہیے: ہم قیادت مانگنے نہیں‘ خدمت کرنے آئے ہیں۔ ہم کسی مسلم ملک کے قومی مفاد کے خلاف نہیں‘ بلکہ تمام مسلم ممالک کے مشترکہ مفاد کے لیے کھڑے ہیں۔ ہم عرب کو اس کی عربیت سے محروم نہیں کرنا چاہتے‘ ترک کو اس کی ترک شناخت سے نہیں‘ ایرانی کو اس کی فارسی تہذیب سے نہیں اور افریقی مسلم ممالک کو ان کی ثقافتی شناخت سے نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ: ان تمام شناختوں کے اوپر ایک مشترک ایمانی شناخت بھی ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہ وہ رشتہ ہے جو رنگ‘ نسل‘ زبان اور جغرافیہ کی تمام حدوں کو عبور کر سکتا ہے۔

ایک تاریخی موقع

آج پاکستان کو ایک نئی سفارتی سوچ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام آباد کو چاہیے کہ وہ تمام مسلم ممالک سے رابطہ کر کے ایک ’’میثاقِ اُمّت کانفرنس‘‘ کی تجویز پیش کرے۔ اس کانفرنس میں تمام مسلم ممالک کی شرکت ہو۔ باہمی تنازعات کے حل کا نظام وضع کیا جائے۔ مشترکہ دفاعی تعاون کا فریم ورک تشکیل دیا جائے۔ مشترکہ معاشی منصوبہ بندی شروع کی جائے۔ مشترکہ امن مشن تشکیل دیا جائے۔ فلسطین و کشمیر اور دیگر مسلم علاقوں کے دیرینہ مسائل کے لیے مشترکہ سفارتی حکمتِ عملی بنائی جائے۔ سائنس‘ ٹیکنالوجی اور تعلیم کے لیے مشترکہ ادارے قائم کیے جائیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے آفاقی پیغام کو دنیا تک پہنچانے کے لیے ایک مشترکہ دعوتی و فکری پلیٹ فارم قائم کیا جائے۔

یہ کوئی خواب نہیں بلکہ قابلِ عمل منصوبہ ہے اور نجات کی راہِ مستقیم!

دنیا میں علاقائی اور اقتصادی اتحاد اس بات کا ثبوت ہیں کہ مختلف ریاستیں مشترکہ مفادات کے لیے ایک پلیٹ فارم بنا سکتی ہیں۔ مسلمان جن کے پاس مشترک عقیدہ‘ مشترک قبلہ‘ مشترک رسول ﷺ‘ مشترک کتاب اور مشترک تہذیبی ورثہ ہے‘ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

ایک نئے عالمی نظام کی بنیاد

میثاقِ اُمّت کا تصور دراصل مسلم دنیا کو ایک نئے مرحلے میں داخل کرنے کی دعوت ہے۔ آج دنیا میں طاقت کا نظام زیادہ تر قومی مفادات کے گرد گھومتا ہے۔ اسلام اس کے مقابلے میں عدل پر مبنی عالمی نظام پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ....﴾ (النحل: ۹۰)

''بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا......''

اگر مسلم دنیا واقعی متحد ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام ہوگا اور دنیا جان لے گی کہ طاقت عدل کے تابع ہو سکتی ہے‘ معیشت اخلاق کے تابع ہو سکتی ہے‘ سیاست اصول کے تابع ہو سکتی ہے اور ریاست انسانیت کی خدمت کر سکتی ہے۔ یہی اسلام کا اصل عالمی پیغام ہے جس کی خوش خبری نبی آخر الزمان ﷺ نے دی تھی۔

اقامتِ دین اور عالمی دعوت

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اُمّتِ مُسلمہ کا آخری مقصد محض اقتصادی ترقی‘ عسکری قوت یا سیاسی اتحاد نہیں۔ یہ سب ذرائع ہیں۔ اصل مقصد اس سے کہیں بلند ہے۔ وہ ہے اقامتِ دین اور عالمی دعوت:

﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''اس دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!''

اور:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ .....﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے......''

لہٰذا اُمّتِ مُسلمہ کی وحدت کا آخری مقصد یہ نہیں کہ مسلمان دنیا کی ایک بڑی طاقت بن جائیں‘ بلکہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے والی اُمّت بنیں اور شہادت علی الناس کا فریضہ کما حقّہٗ ادا ہو سکے۔

انسانیت کو دعوت دیں کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے۔ وہ اللہ ربّ العالمین ہے۔ انسان کی زندگی بے مقصد نہیں۔ موت اختتام نہیں۔ آخرت ایک حقیقت ہے۔

میثاقِ مکّہ سے میثاقِ اُمت' اور میثاقِ اُمّت سے عالمی دعوت۔ اس پورے تصور کو تین دائروں میں سمجھا جا سکتا ہے:

i) میثاقِ مکّہ: مختلف مذاہب' اقوام اور انسانوں کے درمیان امن' احترام' مکالمہ اور بقائے باہمی

ii) میثاقِ اُمّت: مسلم ممالک کے درمیان اتحاد' تعاون' دفاع' معاشی شراکت' سیاسی مشاورت اور باہمی تنازعات کا پُرامن حل

iii) عالمی دعوت: پوری انسانیت کے سامنے اسلام کے آفاقی پیغام کو حکمت' اخلاق' دلیل اور عملی کردار کے ساتھ پیش کرنا

یہ تینوں دائرے ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔

پاکستان کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھائے گا یا اپنی داخلی سیاسی کشمکش میں اُلجھا رہے گا؟ پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی میں ایک واضح اُمّت محوری (Ummah centric) کردار اختیار کرنا ہوگا۔

ہمیں عرب' ایران' ترکیہ' وسطی ایشیا' افریقہ' جنوب مشرقی ایشیا اور مسلم دنیا کے ہر خطے کے ساتھ اپنے تعلقات کو محض دوطرفہ مفادات تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ ہمیں ایک بڑا سوال اٹھانا چاہیے: ہم سب مل کر انسانیت کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اگر پاکستان یہ سوال عالمی سطح پر اٹھاتا ہے تو اس کی آواز محض ایک ریاست کی آواز نہیں رہے گی؛ وہ ایک نظریے کی آواز بن سکتی ہے۔

ایک نئے عہد کی ضرورت ہے۔ پاکستان اپنی نظریاتی اساس کو محض آئینی عبارت یا تاریخی یادگار نہ سمجھے بلکہ اسے اپنی ملی اور عالمی پالیسی کا فعال محرک بنائے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ مسلم دنیا سے کہے: آیئے! ہم اپنے اختلافات ختم نہ بھی کر سکیں تو انہیں اپنی وحدت کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔ ہم اپنی سرحدیں برقرار رکھتے ہوئے اپنے دل جوڑیں۔ اپنی ریاستیں برقرار رکھتے ہوئے اپنی اُمّت کو پہچانیں۔ اپنی زبانیں برقرار رکھتے ہوئے قرآن کی زبان کو اپنا مشترک فکری حوالہ بنائیں۔ اپنی تاریخوں کا احترام کرتے ہوئے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو اپنی مشترک رہنمائی کا مرکز بنائیں۔ اپنے اپنے قومی مفادات سے اوپر اُٹھ کر اُمّت کے اجتماعی مفاد کو اپنی خارجہ پالیسی کا مستقل اصول بنائیں۔

پاکستان کے پاس ایک مشن ہے۔ پاکستان کے قیام کا سوال صرف یہ نہیں تھا کہ ایک نئی

ریاست وجود میں آئے گی بلکہ یہ کہ کیا ایک ایسی ریاست وجود میں آسکتی ہے جو اسلام کو اپنی نظریاتی اساس بنا کر دنیا کے سامنے ایک متبادل تہذیبی و اخلاقی تصور پیش کرے؟

یہ سوال آج بھی زندہ ہے' اور شاید پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ دنیا کو ایک نئی طاقت کی نہیں' ایک نئے اخلاقی وژن کی ضرورت ہے۔ ایک اور عسکری اتحاد کی نہیں' عدل پر مبنی امن کے اتحاد کی ضرورت ہے۔ ایک اور قوم پرستانہ نظریے کی نہیں' انسانی وحدت کے آفاقی تصور کی ضرورت ہے۔ اسلام اس سب کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ اپنی نظریاتی اساس کو پہچانے' اپنی داخلی کمزوریوں پر قابو پائے' اپنے سفارتی اثر کو منظم کرے اور مسلم دنیا کے سامنے میثاقِ اُمّت کا تصور پیش کرے۔

یہ میثاق امریکہ کے خلاف نہ ہو' یورپ کے خلاف نہ ہو' بھارت کے خلاف نہ ہو' کسی قوم کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظلم کے خلاف ہو' ناانصافی کے خلاف ہو' جنگ کے خلاف ہو' انسان کی تحقیر کے خلاف ہو اور انسانیت کے حق میں ہو۔ اس کا پیغام ہو: آؤ! ہم جنگ کے بجائے امن کو اختیار کریں۔ نفرت کے بجائے عدل کو اختیار کریں۔ استحصال کے بجائے انسانیت کی خدمت کریں۔ آخر کار اپنے خالق کی طرف لوٹنے کے لیے اپنی زندگی کو اس کی ہدایت کے مطابق ڈھال لیں۔

میثاقِ مکّہ کی روح کو میثاقِ اُمّت کے ذریعے عالمی سطح تک لے جانے کا یہی راستہ ہے۔ شاید تاریخ ایک دن یہ گواہی دے کہ پاکستان نے اپنی جغرافیائی طاقت سے نہیں بلکہ اپنی نظریاتی قوت سے اُمّتِ مُسلمہ کو ایک نئے سفر پر روانہ کیا۔ وہ سفر جو مکّہ سے شروع ہونے والے امن کے پیغام کو پوری اُمّت کی وحدت سے جوڑتے ہوئے پوری انسانیت تک پہنچائے گا۔ یہ صرف ایک سیاسی منصوبہ نہیں؛ یہ ایک تاریخی ذمہ داری' ایک قرآنی مشن اور ایک عظیم عالمی دعوت ہے۔

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

احیائی تحریکیں اور قیادت کا امتحان

ڈاکٹر فواد لوہانی☆

بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تین طرح کی تحریکیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں: اشتراکی‘ قومی اور احیائی۔ اشتراکی تحریکوں میں بنیادی طور پر دو رجحانات غالب رہے: ارتقائی اور انقلابی۔ ایک گروہ تبدیلی کو بتدریج ارتقائی عمل کے ذریعے آگے بڑھانے کا قائل تھا‘ جبکہ دوسرا فوری اور انقلابی تبدیلی کا خواہاں۔ روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں یہی بنیادی اختلاف بالآخر منشویک اور بولشویک تقسیم کا سبب بنا۔

قومی تحریکوں میں بھی عموماً دو مزاج نمایاں ہوتے ہیں: عقابی اور فاختائی؛ یعنی Hawks اور Doves۔ بعض اوقات یہ دونوں رجحانات الگ الگ سیاسی جماعتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور کبھی ایک ہی جماعت کے اندر مختلف دھڑوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ برصغیر کی ہندو قومی سیاست اس کی ایک قابل فہم مثال ہے۔ گاندھی اور نہرو فاختائی مزاج کے نمائندہ تھے‘ جبکہ ساورکر اور سبھاش چندر بوس عقابی مزاج رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ اختلاف الگ الگ سیاسی جماعتوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم‘ دلچسپ بات یہ ہے کہ فاختائی جماعت‘ یعنی کانگریس‘ کے اندر بھی عقابی روح رکھنے والے عناصر موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ سردار پٹیل اتنے عقابی مزاج کا حامل نہیں تھا کہ ساورکر یا چندر بوس کی صف میں کھڑا ہوتا‘ لیکن بہرحال اس کا مزاج نہرو سے واضح طور پر مختلف تھا۔ یوں ایک ہی جماعت کے اندر عقابی اور فاختائی رجحانات الگ الگ دھڑوں کی صورت میں موجود رہے۔ برصغیر کی مسلم قومی تحریکوں میں بھی یہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔ مسلم لیگ کے اندر سائمن کمیشن کے مسئلے پر بمبئی لیگ اور لاہور لیگ کے نام سے مختلف دھڑے وجود میں آئے۔

جہاں تک تعلق ہے احیائی تحریکوں کا‘ ان کا معاملہ اشتراکی و قومی تحریکوں کے مقابلے میں

☆ای میل: fawad.lohani@gmail.com

کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ احیائی تحریکوں سے مراد بیسویں صدی کی اسلامی احیائی تحریکیں ہیں‘ فاشسٹ تحریکیں نہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ فاشسٹ تحریک اپنی اصل میں تو قومی تحریک ہی ہوتی ہے‘ البتہ کچھ قومی عناصر کو اپیل کرنے کے لیے تہذیبی احیاء کے نعرے بھی اس کی پوٹلی میں ہوتے ہیں‘ جس کی بناء پر سرسری مطالعہ کرنے والوں کو وہ احیائی نظر آتی ہے۔

اسلامی احیائی تحریکوں میں عقابی اور فاختائی مزاج تو موجود ہوتے ہی ہیں‘ لیکن ان کے ساتھ دو مزید مزاج بھی نمایاں ہوتے ہیں یعنی روحانی اور تحریکی۔ یوں ایک اسلامی احیائی تحریک میں بیک وقت چار مختلف رجحانات پرورش پا سکتے ہیں: عقابی‘ فاختائی‘ روحانی اور تحریکی۔

عقابی مزاج رکھنے والے افراد تحریک کو زیادہ تیز رفتار‘ زیادہ جرأت مندانہ اور بعض اوقات مسلّح مزاحمت کی طرف لے جانے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں۔ فاختائی مزاج رکھنے والے افراد تصادم اور انقلابی راستے سے گریز کرتے ہوئے انتخابات اور پارلیمانی سیاست کی طرف بڑھنے کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف دکھائی دیتے ہیں‘ لیکن نفسیاتی اعتبار سے کبھی کبھی دونوں کے پیچھے ایک ہی چیز کارفرما ہوتی ہے‘ اور وہ ہے ’’جلد بازی کی ذہنیت‘‘۔ ایک فوری انقلاب چاہتا ہے‘ دوسرا فوری انتخابی کامیابی! اسی طرح روحانی مزاج رکھنے والے افراد تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کو ہی تمام مسائل کا حل سمجھتے ہوئے پوری تحریک کو خانقاہی ماحول میں محدود کرنے کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ دوسری جانب تحریکی مزاج رکھنے والے افراد نظریاتی اور سیاسی جِدّو جُہد میں اس قدر منہمک ہو سکتے ہیں کہ فرائض و واجبات اور اصلاحِ باطن کی بنیادی اہمیت پسِ پشت چلی جائے۔ گہرائی سے دیکھا جائے تو ایک گروہ عیسائیت و بدھ مت کے خانقاہی نظام سے متاثر ہوتا ہے تو دوسرا گروہ کمیونسٹ و نازی پارٹی کے charm سے متاثر ہوتا ہے۔ یوں ایک طرف تحریک خانقاہ بننے کا خطرہ رکھتی ہے اور دوسری طرف محض سیاسی تنظیم بن جانے کا۔

ایسی صورتِ حال میں‘ بانیٔ تحریک کی شخصیت ایک نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب تک بانیٔ جماعت یا بانیٔ تحریک زندہ رہتے ہیں‘ عموماً یہ مختلف (اور کافی حد تک متصادم) مزاج کسی نہ کسی طرح ایک وسیع تر قیادت کے تحت باہم مربوط رہتے ہیں۔ بانی کی شخصیت ان مختلف

رجحانات کے درمیان ایک توازن قائم رکھتی ہے۔ البتہ جیسے ہی نئی قیادت سامنے آتی ہے‘ مختلف مزاج رکھنے والے افراد اپنی اپنی ترجیحات کو تحریک پر غالب کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ ہر گروہ سمجھتا ہے کہ تحریک کو اصل راستے پر وہی لے جا سکتا ہے۔

عقابی مزاج رکھنے والے افراد تحریک کو ’بعض اوقات‘ ناکافی تیاری کے باوجود مسلح مزاحمت کی طرف لے جانے پر آمادہ ہوتے ہیں؛ فاختائی مزاج رکھنے والے افراد انقلابی راستے کو ترک کر کے انتخابات اور پارلیمانی سیاست کی طرف بڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ روحانی مزاج رکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ تحریک کو اپنی تمام تر توجہ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن پر مرکوز کر دینی چاہیے؛ تحریکی مزاج رکھنے والے نظریاتی اور سیاسی جِدّوجُہد کو تحریک کا بنیادی فریضہ قرار دیتے ہیں۔

نئی قیادت کے لیے ان چاروں مزاجوں کو تحریک کے اندر متوازن رکھنے کے دو بنیادی طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ جماعت کے تمام افراد کو مسلسل یہ احساس دلایا جاتا رہے کہ تحریک کسی ایک فرد‘ گروہ یا مزاج کی ملکیت نہیں۔ تمام مزاجوں کے حامل افراد کو مسلسل یہ باور کرایا جاتا رہے کہ تحریکی زندگی میں نجویٰ‘ گروہی عصبیت اور اپنی ذاتی رائے کو پوری تحریک پر مسلط کرنے کی خواہش سے بچنا ضروری ہے۔ کسی مخصوص مزاج یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ترجیحات و مزاج کو پوری تحریک کا واحد راستہ قرار دے۔ اس ضمن میں تربیتی اجتماعات و کورسز میں رفقاء و کارکنان کو قرآن و حدیث کے حوالوں کے ذریعے نجویٰ کے دُنیوی و اُخروی نقصانات سے مسلسل آگاہ کرنا ضروری ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قائدِ تحریک خود کسی ایک مزاج کی طرف غیر متوازن جھکاؤ کا مظاہرہ نہ کرے۔ قائد کا یہ توازن صرف اس کے ذہن میں موجود ہونا کافی نہیں؛ اسے اپنے قول و فعل سے مسلسل ظاہر کرنا ضروری ہے۔ یہاں سے شروع ہوتا ہے قائد کا امتحان۔ اگر وہ اپنی روحانی کیفیت کو زیادہ نمایاں کرے تو تحریکی مزاج رکھنے والے اسے خانقاہی سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر وہ سیاسی اور انقلابی تجزیے زیادہ پیش کرے تو روحانی مزاج رکھنے والے اسے محض تحریکی سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر وہ سیاسی عمل سے گریز کرے تو فاختائی مزاج رکھنے والے اسے غیر عملی سمجھ سکتے ہیں‘ اور اگر وہ مزاحمت کی بات کرے تو عقابی مزاج رکھنے والے اسے اپنا ہم مزاج سمجھنے لگتے ہیں۔

چنانچہ قائد کی خاموشی بھی کبھی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ ہر گروہ اسے اپنی خواہش کے آئینے میں دیکھنے لگتا ہے۔ اسے کسی ایک مزاج کا نمائندہ بننے کے بجائے مختلف مزاجوں کو تحریک کے بنیادی مقصد کے تابع رکھنا ہوتا ہے۔

قائدِ تحریک کے لیے اصل چیلنج یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک مزاج کے حامل افراد کو تحریک سے نکال دے یا کسی ایک رجحان کو مکمل طور پر مسترد کر دے۔ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف مزاج رکھنے والے افراد کو تحریک کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل اساس کے تابع رکھے۔ عقابی مزاج رکھنے والوں کی جرأت اور عزم سے فائدہ اٹھائے، فاختائی مزاج رکھنے والوں کے تدبر اور سیاسی بصیرت کو بھی جگہ دے، روحانی مزاج رکھنے والوں کی اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کی اہمیت کو برقرار رکھے، تحریکی مزاج رکھنے والوں کی نظریاتی و عملی جِدّ و جُہد کو بھی تحریک کی قوت بنائے۔ اس پورے عمل میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ کوئی ایک مزاج پوری تحریک کی شناخت نہ بن جائے۔

تنظیم اسلامی کے حوالے سے امیرِ ثانی محترم حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ کی قیادت کا نمایاں پہلو یہی رہا کہ انہوں نے کسی ایک مزاج کی جانب اپنا جھکاؤ غیر متوازن نہیں ہونے دیا۔ نہ تنظیم اسلامی کو محض ایک روحانی جماعت بننے دیا، نہ اسے صرف نظریاتی و فکری بحثوں تک محدود ہونے دیا، نہ اسے جلد بازی میں کسی مسلح مزاحمت کی طرف لے جانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی انقلابی و احیائی اساس کو ترک کر کے اسے محض ایک انتخابی سیاسی جماعت بنانے کی طرف پیش قدمی کی۔ ان کی کوشش یہی رہی کہ تنظیم اسلامی کی اصل شناخت، یعنی اس کا احیائی ہونا، برقرار رہے۔

احیائی تحریک صرف فرد کی اصلاح کا نام نہیں، اگرچہ یہ اس کا بنیادی نقطۂ آغاز ہے۔ یہ صرف سیاسی تبدیلی کا نام بھی نہیں، اگرچہ معاشرے اور ریاست کی اصلاح بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ محض روحانی تربیت بھی نہیں، اگرچہ تزکیۂ نفس اس کی بنیاد ہے۔ یہ صرف نظریاتی و سیاسی جِدّ و جُہد بھی نہیں، اگرچہ فکر اور عمل کے بغیر کوئی احیائی تحریک زندہ نہیں رہ سکتی۔ احیائی تحریک دراصل ان تمام عناصر کو ان کے صحیح مقام پر رکھتے ہوئے ایک جامع دینی مقصد کی طرف پیش قدمی کا نام ہے۔

قائدِ تحریک کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ وہ مختلف مزاجوں کو ختم کر دے۔ اصل خوبی یہ ہے کہ وہ

ان مختلف مزاجوں کو ایک بڑے مقصد کے تابع رکھے۔ احیائی تحریک میں قیادت محض انتظامی منصب نہیں ہوتی بلکہ مختلف مزاجوں کے درمیان توازن قائم رکھنے‘ تحریک کی اصل شناخت کی حفاظت کرنے اور ہر گروہ کو یہ یاددلاتے رہنے کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ مزاج مختلف ہو سکتے ہیں‘ مگر مقصد ایک ہی رہے گا۔ وہ کسی ایک مزاج کا نمائندہ بنے بغیر‘ اور کسی دوسرے مزاج کا مزاحم بنے بغیر‘ تمام مزاجوں کو تحریک کے اصل مقصد کا نمائندہ بنا سکے۔ راستے کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے‘ رفتار کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے‘ ترجیحات کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے؛ لیکن اگر منزل ہی نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو تحریک اپنے وجود کا بنیادی جواز کھو دیتی ہے۔ احیائی تحریک میں تزکیۂ نفس بھی ہے‘ فکر و شعور کی بیداری بھی؛ دعوت بھی ہے‘ تنظیم بھی؛ اصلاحِ فرد بھی ہے‘ اصلاحِ معاشرہ بھی؛ اور ایک عادلانہ نظام کے قیام کی جدوجہد بھی۔

امیرِ ثانی محترم حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے اسی جامعیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی قیادت میں تنظیم اسلامی کے حوالے سے یہی کوشش نمایاں بھی دکھائی دیتی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک پہلو پوری تحریک کی شناخت نہیں بنا۔ وہ جانتے تھے کہ: اگر روحانی مزاج غالب آ جائے تو تحریک خانقاہ بن سکتی ہے۔ اگر تحریکی مزاج غالب آ جائے تو اصلاحِ باطن پسِ پشت جا سکتی ہے۔ اگر فاختائی مزاج غالب آ جائے تو احیائی مقصد انتخابی سیاست میں تحلیل ہوسکتا ہے۔ اگر عقابی مزاج غالب آ جائے تو تحریک وقت سے پہلے تصادم اور مزاحمت کی طرف دھکیلی جا سکتی ہے۔ کسی بھی احیائی تحریک کی کامیابی و بقا کا بنیادی راز یہی ہے کہ ان تمام پہلوؤں‘ مزاجوں اور رجحانات کو ان کے صحیح مقام پر رکھے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ بانیٔ تنظیم ہیں‘ تو حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ محسنِ تنظیم۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی‘ اس کے فکر و نظریے کو تشکیل دیا‘ اس کی سمت متعین کی اور اسے ایک مکمل اسلامی احیائی تحریک بنایا۔ حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے مختلف مزاجوں کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے تنظیم اسلامی کو آگے بڑھایا‘ اس کی اصل احیائی شناخت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور اسے کسی ایک رجحان کے غلبے سے محفوظ رکھا۔ ایک نے بنیاد رکھی‘ دوسرے نے عمارت کو سنبھالا۔ کسی بھی احیائی تحریک کے لیے سب سے بڑی خوش بختی ہے کہ اسے ایسا بانی ملے جو اس کی نظریاتی سمت قرآن و سنّت کی روشنی میں متعین کرے‘ اور دوسری بڑی

خوش بختی یہ کہ اسے ایسا جانشین ملے جو اس کے وجود‘ مزاج اور مقصد کی حفاظت کرے۔

احیائی تحریکوں کو جو دوسرا مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ شخصیت پرستی کا ہوتا ہے۔قومی واشتراکی تحریکیں شخصیت پرستی کا شکار ہوں یا نہ ہوں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا‘ کیونکہ ان کا مطمح نظر دنیا ہی ہوتا ہے؛ لہٰذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لینن‘ ماؤ اور کم ال سونگ کے مجسمے نصب ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ آپ مارکس کو follow کر رہے ہیں‘ لینن کو یا سٹالن کو۔ البتہ جب بات آتی ہے اسلامی احیائی تحریک کی تو یہاں ذرا سی غفلت افراد و تحریک کو حقیقی نصب العین (اللہ کی رضا) سے ہٹا دیتی ہے۔ احیائی تحریکوں کے کارکنان کے ذہن میں اس بات کو راسخ کرنا بھی قیادت کا کام ہے کہ ان کے لیے اصل اتھارٹی شاہ ولی اللہ‘ علامہ اقبال‘ ابوالکلام آزاد‘ حسن البنا‘ سید مودودی یا ڈاکٹر اسرار احمد ﷭ نہیں‘ بلکہ قرآن و سنّت ہی ہیں۔

اللہ ربّ العزت کا صد شکر‘ کہ تنظیم اسلامی اس محاذ پر بھی کامیاب رہی۔ اس کے رفقاء کی تربیت اسی نہج پر ہوتی ہے کہ اصل اتھارٹی بانی تنظیم یا امیر تنظیم نہیں‘ بلکہ کلامِ الٰہی اور سُنّتِ خاتم الانبیاء ﷺ ہیں۔ بانی تنظیم کوئی رسول یا نبی نہیں کہ ان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا‘ اور امیر تنظیم کی اطاعت بھی مطلق نہیں‘ بلکہ ’’فی المعروف‘‘ ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں ایک اسلامی احیائی تحریک اور دیگر تحریکوں میں فرق واضح ہوتا ہے۔

جہاں ایک جانب شخصیت پرستی احیائی عمل کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے‘ وہیں دوسری جانب ایک اور نفسیاتی واردات بھی احیائی عمل کے لیے مضر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ تحریک کے رفقاء کسی قسم کے تحزب کا شکار نہ ہو جائیں۔ رفقاء تنظیم کو تواتر سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تنظیم اسلامی ’’الجماعت‘‘ نہیں۔ جس طرح معاشرے کے لیے نسلی و لسانی تعصب زہر قاتل ہوتا ہے‘ اسی طرح احیائی عمل کے لیے جماعتی تحزب مہلک ہوتا ہے۔ تحزب کے جذبات ہی بعد میں فرقے کی بنیاد بنتے ہیں۔ بانی محترم کا کتابچہ ’’دینی جماعتوں کے باہمی تعاون و اتحاد کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی‘‘ درحقیقت اسی سوچ کا آئینہ ہے کہ تنظیم اسلامی تحزب کے جذبات سے پاک ایک تحریک ہے۔

امیر ثانی حافظ عاکف سعید ﷾ کی قیادت کا ایک اور تاریخی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے نئے امیر کے لیے دستورِ تنظیم کے مطابق طریقہ کار اختیار کیا اور محترم شجاع الدین شیخ ﷾ کو امیر ثالث

مقرر کر کے تنظیم اسلامی میں موروثی قیادت کے ہر امکان کی نفی کر دی۔ برصغیر کی متعدد سیاسی و مذہبی جماعتوں کے برعکس‘ جہاں قیادت وقت کے ساتھ ایک خاندان کی میراث بن گئی‘ تنظیم اسلامی نے یہ واضح کر دیا کہ وہ کسی ایک خاندان کی میراث نہیں بلکہ اُمّتِ مُسلمہ کی احیائی تحریک ہے۔ باپ کے بعد بیٹے کا امیر بننا شرعاً حرام نہیں‘ تاہم اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ قیادت ایک ہی خاندان کی میراث بن کر رہ جائے۔ قیادت نسب سے نہیں بلکہ اہلیت‘ تقویٰ اور تحریکی صلاحیت سے متعین ہوتی ہے۔ محترم حافظ عاکف سعید نے عملاً ثابت کیا کہ تنظیم اسلامی پر کسی ایک خاندان کی اجارہ داری نہیں۔ بانیٔ امیر نے تنظیم کی بنیاد رکھی‘ امیرِ ثانی نے عمارت سنبھالی‘ اور اس فکر کو راسخ کیا کہ تنظیم بذاتِ خود مقصد نہیں‘ بلکہ حقیقی نصب العین (رضائے الٰہی) کے حصول کا ذریعہ ہے۔

احیائی تحریکوں اور ان کے کارکنان کو معاشرتی زندگی میں جو کچھ درپیش ہوتا ہے‘ ان کا حل قرآن و سُنّت میں موجود ہے۔ بانی محترم کا مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب نمبر ۲ (حزب اللہ کے اوصاف اور امیر و مامورین کا باہمی تعلق) وہ کتاب ہے جو تمام سماجی و نفسیاتی مسائل کا حل بتاتی ہے؛ کیونکہ یہ قرآن کریم کی منتخب آیات کے دروس پر مشتمل نصاب ہے۔

اللّٰھم صَلِّ علٰی مُحَمَّد و علٰی آلِ مُحَمَّد !

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

حُسنِ اَخلاق کے ثمرات

احمد علی محمودی☆

حسنِ اخلاق (اچھا رویہ اور بہترین برتاؤ) انسانی شخصیت کا وہ جوہر ہے جو نہ صرف فرد کی اپنی زندگی کو سنوارتا ہے‘ بلکہ پورے معاشرے میں امن اور محبت کی بنیاد بھی رکھتا ہے۔ یہ محض مسکراہٹ یا خوش کلامی کا نام نہیں‘ بلکہ اس میں صلہ رحمی‘ والدین کی فرماں برداری‘ نرم گفتاری‘ حلم و بردباری‘ عفوودرگزر‘ بڑوں کا ادب‘ چھوٹوں پر شفقت‘ دیانت وامانت‘ عہد کی پاس داری‘ صبر وشکر‘ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی‘ بھائی چارا‘ ہمدردی اور ایثار کا جذبہ یہ سب شامل ہیں۔ خوش اخلاقی محض ایک سماجی خوبی نہیں‘ بلکہ ایسی صفت ہے جسے قرآن وسُنّت میں بارہا سراہا گیا ہے۔ بزرگانِ دین‘ صحابہ کرام‘ اہلِ بیت اطہار‘ علماء‘ صوفیاء اور مفسرین نے اس کو دینِ اسلام کی روح قرار دیا ہے۔ انسانی زندگی میں حسنِ اَخلاق کو جو اہمیت وعظمت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہر مذہب اور دھرم کے لوگ اچھے اخلاق وکردار کے قائل ہیں۔

اسلام میں حسنِ اخلاق کو ایمان کی تکمیل قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) [الموطّا] ”مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔“ حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس اخلاقِ حسنہ کا کامل پیکر تھی۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ((کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ)) (مسند احمد) ”آپ کا خُلق سراپا قرآن تھا“ یعنی جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا‘ وہی آپ ﷺ کی طبیعت چاہتی تھی اور جس چیز کو برائی قرار دیا‘ اس سے آپ ﷺ کو نفرت تھی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴﴾ (القلم) ”اور بے شک آپ اخلاق

☆ادارتی معاون wad_hsp@yahoo.com

کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔‘‘ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو اخلاقِ حسنہ کا عملی نمونہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ’’تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات میں نہایت ہی حسین نمونۂ حیات موجود ہے۔‘‘

حسنِ اَخلاق کے بے شمار ثمرات ہیں جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ذیل میں حسنِ اَخلاق کے ان ثمرات اور فوائد کا تذکرہ ہے جو دنیا اور آخرت میں حاصل ہوتے ہیں۔

حسنِ اَخلاق کے دنیوی ثمرات

(۱) دل میں محبت: حسن اخلاق کے ذریعہ معاشرے میں بھائی چارا، اتحاد و اتفاق، پیار و محبت، عفو و درگزر، نرمی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی کے ذریعہ اختلافات، نفرت، عداوت اور بغض و کینہ دور ہوتے ہیں۔ حسن اخلاق کی بدولت سخت ترین دشمن بھی دوست بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِيۡ هِيَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِيۡ بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيۡمٌ ۝۳۴﴾ (حٰم السجدۃ) ’’برائی کو اس بھلائی سے دفع کرو جو اس سے بہتر ہو، پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، ایسا ہو جائے گا جیسے وہ کوئی دِلی دوست ہے۔‘‘

فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ مکہ میں فاتحانہ انداز میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوئے۔ کفار و مشرکین نے ہر قدم پر آپ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تکالیف پہنچائی تھیں۔ وہ آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے، آپ ﷺ کے قتل کی تدبیریں اور سازشیں کرتے تھے۔ انہوں نے اسلام دشمنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر وہ سہمے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر بدترین سلوک کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ایسے میں لشکر اسلام میں سے کچھ لوگوں نے نعرہ لگا دیا: ’’اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ‘‘ یعنی آج کُشت و خون کا دن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے رد کرتے ہوئے فرمایا: ’’اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ‘‘ یعنی آج کا دن رحمت اور معافی کا دن ہے۔ پھر تاریخ نے دیکھا کہ رحمتِ دو جہاں کے پیکر اور محسنِ انسانیت ﷺ کی شفقت جوش میں آئی اور زبانِ رسالت سے یہ اعلان کر دیا گیا: ’’لا تثریب علیکم الیوم ، اذھبوا فأنتم الطلقاء‘‘ جاؤ آج تم سب آزاد ہو، تمہیں معاف کر دیا گیا، اور تم سے کسی بھی قسم کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔‘‘ یہ حسنِ اخلاق کی وہ بلند ترین سطح تھی، جس نے مکہ کے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔ جو

لوگ کل تک اسلام کے دشمن تھے‘ وہ اس اخلاق کو دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

(۲) دوستوں میں اضافہ: خوش اخلاقی انسان کے وقار کو بڑھاتی ہے۔ لوگ ایسے انسان کی طرف راغب ہوتے ہیں‘ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کی بات سنتے ہیں۔ خوش اخلاقی سے جہاں دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے‘ وہیں دشمنوں میں کمی آتی ہے۔

(۳) معاشرے میں امن اور ہم آہنگی: حسن اخلاق معاشرے سے احقاد (دل کے اندر چھپی ہوئی عداوت) اور جھگڑوں کو ختم کرتا ہے۔ یہ تعاون اور اجتماعی عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ معاشرے میں صدق‘ باہمی افہام و تفہیم‘ عدل اور حلم جیسی اقدار کو فروغ دیتا ہے۔

(۴) انسان کا زیور: حسنِ اخلاق درحقیقت انسان کا زیور اور اس کی خوبصورتی ہے۔ اس کے ذریعہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے دل فتح ہوتے ہیں۔ درحقیقت حسن اخلاق ہی کی وجہ سے انسان اعلیٰ اور انمول ہیرا بنتا ہے۔

(۵) انفرادی اور نفسیاتی فوائد: اچھا اخلاق رکھنے والا شخص خود اپنی ذات میں سکون محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ نرمی اور درگزر سے پیش آنے والا شخص حسد‘ بغض اور غصے جیسی بیماریوں سے بچا رہتا ہے‘ جس سے اسے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ خوش اخلاقی انسان کے اعتماد میں اضافہ کرتی ہے اور اسے ایک باوقار شخصیت کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ فطری طور پر انسان اچھے اخلاق والے کی طرف کھنچا چلا آتا ہے‘ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ’’اخلاق وہ خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس کی جا سکتی ہے۔‘‘

حسنِ اَخلاق کے اُخروی ثمرات

(۱) اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کا قرب: حسن اخلاق انسان کو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے قریب کرتا ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جو بندے کو رب کا‘ اور رب کے محبوب ﷺ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا))

[رواه الترمذي]

’’میرے نزدیک تم میں (دنیا میں) سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو تم میں بہترین اخلاق والے ہیں۔‘‘

(۲) ایمان کی تکمیل: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ اِيمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) [أبو داود والترمذي]

''مؤمنین میں کامل ترین ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔''

حسن اخلاق ایمان کی علامت اور اس کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

(۳) بلندیٔ درجات: ایک حدیث میں ہے:

((إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ))[رواہ أبوداود]

''بندہ مؤمن اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے روزہ رکھنے والے اور رات بھر عبادت کرنے والے کے درجہ کو حاصل کر لیتا ہے۔''

یعنی حسن اخلاق عبادت کے بلند درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

(۴) میزان (اعمال کا پلڑا) بھاری کرنا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ اَثْقَلَ شَيْءٍ يُوضَعُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ))

[رواہ الترمذی]

''روزِ قیامت مؤمن کے اعمال کی میزان میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہیں رکھی جائے گی۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاقِ حسنہ کا اجر و ثواب انتہائی عظیم ہے۔

(۵) جنت کا سبب: حسن اخلاق جنت میں داخلے کا سبب ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان **اعمال** کے بارے میں پوچھا گیا جو لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے والے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((التقویٰ وحُسْنُ الخُلُق)) [رواہ ابن ماجه والترمذي]

''اللہ کا تقویٰ اور حسنِ اخلاق!''

حسنِ اخلاق کے چند عملی پہلو

خود کو دوسروں سے برتر نہ سمجھنا: دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دینا۔ قول و فعل میں سچائی اختیار کرنا۔ اللہ اور بندوں کا احسان ماننا۔

اخلاقی چارٹر: آپ اپنے موبائل میں یا کسی جگہ یہ تین باتیں لکھ کر رکھ لیں، جو حسنِ اخلاق کی بنیاد ہیں:

i) **زبان کی حفاظت**: بات کرنے سے پہلے سوچیں کہ کیا یہ سچ ہے! کیا یہ ضروری ہے؟ کیا یہ بات کسی کا دل تو نہیں دکھائے گی؟

ii) **مسکراہٹ کا تحفہ**: کسی سے ملتے وقت مسکرانا سُنّت بھی ہے اور صدقہ بھی۔

iii) **خاموشی کا ہنر**: جب بحث بڑھنے لگے تو خاموشی اختیار کر لینا' اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے۔

حسنِ اَخلاق: پانچ عملی مشقیں

(۱) **پہل کرنا**: جب بھی کسی سے ملیں تو مسکرا کر اور سلام میں پہل کریں۔ یہ دوسرے کے دل میں آپ کے لیے جگہ بنا دیتا ہے۔

(۲) **خاموشی اور سماعت**: دوسرے کی بات مکمل ہونے تک غور سے سنیں اور فوراً جواب دینے کے بجائے پہلے اس کی بات سمجھیں۔

(۳) **لفظوں کا انتخاب**: ''شکریہ''، ''معذرت'' اور ''مہربانی'' جیسے الفاظ کا کثرت سے استعمال کریں۔ یہ الفاظ لہجے کی تلخی ختم کرتے ہیں اور باہمی الفت و محبت کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔

(۴) **توقف (pause)**: جب غصہ آئے تو فوراً کوئی ردِّعمل نہ دیں بلکہ ۱۰ تک گنتی گنیں' یا جگہ بدل لیں' یا وضو کر لیں۔ غصے میں دیا گیا جواب بدتمیزی کہلاتا ہے اور اس پر شرمندگی بھی ہوتی ہے۔

۵۔ **اچھا گمان**: دوسروں کے افعال کی مثبت تاویل کریں۔ اگر کسی نے آپ کو جواب نہیں دیا یا آپ کی کال اٹینڈ نہیں کی' تو سوچیں شاید وہ کسی پریشانی میں ہوگا یا وہ کہیں مصروف ہوگا۔ یہ سنہری اصول یاد رکھیں کہ اخلاق وہ نہیں جو آپ اپنے سے بڑے یا طاقتور کے ساتھ دکھاتے ہیں (وہ تو مصلحت یا ڈر ہو سکتا ہے)' بلکہ اصل اخلاق وہ ہے جو آپ اپنے ماتحت یا کسی کمزور کے ساتھ برتتے ہیں۔

ایک عملی ٹوٹکا: روزانہ رات کو سونے سے پہلے صرف دو منٹ کے لیے یہ سوچیں: ''آج میری زبان یا عمل سے کسی کو دکھ تو نہیں پہنچا؟'' اگر پہنچا ہے' تو جلد اس کی تلافی کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سادہ سی مشق آپ کو چند ہی دنوں میں ایک بہترین انسان بنا دے گی۔

گھریلو زندگی اور کام کی جگہ

یہ دو ایسے میدان ہیں جہاں انسان کے اخلاق کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ ان دونوں جگہوں

پرخوش اخلاقی اختیار کرنے کے لیے کچھ عملی آداب درج ذیل ہیں:

(۱) گھریلو زندگی میں حسنِ اَخلاق: گھر وہ جگہ ہے جہاں ہم عموماً ''بغیر کسی نقاب'' کے ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي))[سنن الترمذی:۳۸۹۵]

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔''

گھر والوں سے بات کرتے ہوئے آواز کو پست رکھنا اور محبت بھرے الفاظ استعمال کرنا سکون کا باعث بنتا ہے۔ گھر میں نوک جھونک فطری ہے' لیکن ''بڑا'' وہ ہے جو معاملے کو رفع دفع کردے' غلطی ہونے پر معافی مانگنے میں پہل کرے اور اپنا دل صاف کرلے۔ گھر کے کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا' حسنِ اخلاق کی بہترین مثال ہے۔ گھر کے افراد کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں کی تعریف کریں اور ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کریں۔ یہ تمام امور باہمی الفت و محبت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

(۲) جائے معاش پر حسنِ اَخلاق: ملازمت یا کاروبار میں آپ کا رویہ آپ کی پیشہ ورانہ کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر آپ افسر ہیں تو اپنے جونیئرز کے ساتھ سختی کے بجائے رہنمائی کا رویہّ اپنائیں۔ ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا' آپ کی شخصیت کو معتبر بناتا ہے۔ اپنے کام کو وقت پر اور ایمان داری سے مکمل کرنا بھی حسن اخلاق کا حصہ ہے۔ یہ آپ کا وقار بڑھاتا ہے۔ ساتھیوں کے اچھے کام کی کھل کر تعریف کریں۔ حسد کے بجائے دوسروں کی کامیابی پر خوش ہونا اور مبارک باد دینا' ایک اعلیٰ ظرف انسان کی نشانی ہے۔ اگر کسی کی اصلاح کرنی ہو تو اسے اکیلے میں پیار سے سمجھائیں' سب کے سامنے شرمندہ کرنا حسنِ اَخلاق کے خلاف ہے۔

اقوالِ زریں اور جامع دعائیں

(۱) منتخب اقوالِ زریں (حکمت کی باتیں)

- ''تمہارا نفس تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے' اسے اچھے اخلاق سے زیر کرو۔'' (حضرت علیؓ)
- ''تمہارا اخلاق تمہاری پہچان ہے' ورنہ ایک نام کے تو دنیا میں ہزاروں لوگ بستے ہیں۔'' (شیخ سعدی)
- ''خوب صورتی آنکھوں کو متاثر کرتی ہے' لیکن اچھا اخلاق دل جیت لیتا ہے۔''

◀ ''لوگوں کے ساتھ ویسا ہی رویہّ اپناؤ' جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ اپنائیں۔''

(۲) مسنون دعائیں

آئینہ دیکھتے وقت کی دعا:

((اللّٰهُمَّ أَحْسَنْتَ خَلْقِي، فَأَحْسِنْ خُلُقِي))[مسند احمد]

''اے اللہ! جس طرح آپ نے میری صورت اچھی بنائی ہے' میری سیرت بھی اچھی کر دیں۔''

ایک جامع دعا:

((اللّٰهُمَّ اهْدِنِي لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ، لَا يَهْدِي لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ))[صحیح مسلم:۱۸۱۲]

''اے اللہ! مجھے حسن اخلاق کی ہدایت عطا فرما' ان اخلاق حسنہ کی جانب صرف تُو ہی رہنمائی کرنے والا ہے۔ اور بُرے اخلاق مجھ سے دور کر دے' تیرے سوا بُرے اخلاق کو مجھ سے دور کرنے والا کوئی نہیں''

حاصلِ کلام

حسنِ اَخلاق انسان کی زندگی کا قیمتی اثاثہ اور بیش بہا سرمایہ کاری ہے' جس کا نفع دنیا میں عزت' محبت اور کامیابی جبکہ آخرت میں نجات' بلند درجات' جنت' اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے قرب کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کے لیے کسی مال و دولت کی ضرورت نہیں' بلکہ صرف ایک مثبت سوچ اور بڑے دل کی ضرورت ہے۔ حسنِ اَخلاق کو محض ایک نظریہ سمجھنے کے بجائے اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا ہی اصل کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعلیٰ اخلاق کا پیکر بنائے اور ہماری زندگی میں آسانیاں پیدا فرمائے۔ (آمین یا ربّ العالمین!)

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

ندامت کے آنسو: خطا کار کا قیمتی سرمایہ

حافظ محمد اسد☆

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بنی آدم پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر خاص و عام کے لیے ہر وقت کھلا رکھا ہے۔ غیر مسلم کے لیے تو خصوصی اعزاز ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی ''نومولود بچے'' کی مانند پاک صاف ہو جاتا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ چاہے کتنا ہی بڑا گناہ سرزد ہو جائے، فوری طور پر سچے دل سے توبہ کر لے اور ندامت کے آنسو بہالے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے فضل واحسان سے سب معاف فرما دیتے ہیں۔ اصل میں شیطان ہمیں توبہ کرنے سے روکتا ہے۔ کہتا ہے: ''ارے احمق! روز یہ گناہ کرتا ہے اور معافی مانگتا ہے۔ شرم کر، کس منہ سے معافی مانگتا ہے!'' چنانچہ انسان مایوس ہو کر توبہ کرنا ترک کر دیتا ہے۔

گناہ اور قصور انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے اللہ کا دربار چھوڑ دیا جائے؟ اللہ کا دربار چھوڑ کر کوئی اور جائے پناہ کہاں ہے جس کا سہارا لیا جائے؟ اس لیے تمام گناہ گار توبہ کریں اور ندامت کے آنسو بہا کر اللہ سے معافی مانگیں۔ وہ یقیناً معاف کرے گا اور خطاؤں کو بخش دے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک گناہوں اور خطاؤں سے پاک تھی۔ آپ ﷺ معصوم عن الخطا تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کثرت سے توبہ کرتے تھے، محض ہماری تعلیم کے لیے۔ لہٰذا ہمیں بھی زیادہ سے زیادہ توبہ واستغفار کرنا چاہیے، کیوں کہ ہم سے چھوٹے بڑے بے شمار گناہ شب وروز ہوتے رہتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوْا إِلَى اللّٰهِ، فَإِنِّيْ أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ))[1]

''اے لوگو! اللہ کے حضور توبہ کرو، کیوں کہ میں دن بھر میں اُس کے سامنے سو بار توبہ کرتا ہوں۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

☆استاد قرآن اکیڈمی، یٰسین آباد، کراچی hafizasad@quranacademy.com

((وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً))(۲)

’’اللہ کی قسم! میں ایک دن میں ستّر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔‘‘

بار بار توبہ کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی گناہ سے ایک مرتبہ توبہ کرنے کے بعد پھر سے وہی گناہ سرزد ہو جائے تو دوبارہ توبہ کر لی جائے۔ اس میں شرم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس توبہ واستغفار کے نتیجہ میں گناہ کو ترک کرنے کا داعیہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔

گناہ پر اصرار یعنی بے فکری اور بے خوفی کے ساتھ گناہ کرتے رہنا اور توبہ بھی نہ کرنا بڑی بدبختی اور بہت برے انجام کی نشانی ہے۔ ایسا عادی مجرم اللہ کی رحمت کا مستحق نہیں۔ اس لیے احادیث میں گناہ پر ندامت اور توبہ کی تاکید کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس بات کا احساس رہتا ہے کہ ہم سے دن بھر میں کتنے گناہ سرزد ہو رہے ہیں؟ کیا ہمیں گناہ کے فوراً بعد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہوتی ہے؟ اگر نہیں‘ تو لمحۂ فکریہ ہے‘ کیونکہ موت سامنے کھڑی ہے۔ کس وقت زندگی کا معاملہ لپیٹ دیا جائے‘ کچھ خبر ہی نہیں۔ اصل میں توبہ ’’ندامت‘‘ کا نام ہے لیکن جب گناہ کا احساس تک نہ ہو تو پشیمانی کیسے ہو؟ احساسِ گناہ نہ ہونا ایک خطرناک روحانی بیماری ہے کیونکہ اس میں مبتلا مریض اپنی اصلاح نہیں کرتا۔ گناہ کرتے کرتے بالآخر وہ وقت آجاتا ہے کہ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو جناب رسول کریم ﷺ نے یوں واضح فرمایا ہے:

((إِنَّ العَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبَهُ))(۳)

’’بے شک جب بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل میں لگا دیا جاتا ہے‘ پھر جب وہ گناہ چھوڑ دیتا ہے اور استغفار و توبہ کرتا ہے‘ تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے‘ اور یہ (بغیر توبہ کیے ہوئے) دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس نقطہ میں زیادتی کر دی جاتی ہے‘ یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔‘‘

کوئی شخص توبہ و استغفار نہ کرے‘ بلکہ مستقل گناہ کرتا رہے‘ تو سیاہ نقطہ بڑھتا چلا جاتا ہے‘

یہاں تک کہ اس کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ پھر حق قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ توبہ سے غفلت کی وجہ گناہوں کا وہ ماحول ہے جس میں ہماری اکثریت ملوث رہتی ہے۔ مثلاً فلمیں اور ڈرامے دیکھنا' شادی بیاہ میں آلاتِ موسیقی اور مخلوط محافل' اسمارٹ موبائل کا بے جا استعمال۔ اس کے ساتھ معیشت کے اعتبار سے سودی کاروبار اور دھوکا دہی کرنا' رشوت کا لین دین' ناپ تول میں کمی' مادی عیش کی ہوس اور دنیا ہی کے غم میں رات دن گھلتے رہنا۔ یہ وہ ماحول ہے جس میں آخرت کا خیال آنا تو درکنار' گناہ کا احساس تک ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً بُرائی بُری نہیں لگتی بلکہ کچھ عرصہ ایسے ماحول میں رہنے سے بُرائی سے منع کرنے والوں کو ہی بُرا سمجھا جانے لگتا ہے۔ گویا کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں' عقل و حواس کھو جاتے ہیں۔ ایسے افراد کا سننا' دیکھنا' چلنا پھرنا گویا جانوروں کی طرح ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹﴾ (الاعراف)

''اور ہم نے جِنّات اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں' ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں' بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

جانوروں میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی آیات سمجھنے' دیکھنے اور سننے کی قوت ہی نہیں' لہٰذا اگر وہ نہ سمجھیں تو معذور ہیں' لیکن انسان کے اعضاء میں یہ قوت موجود ہے' پھر بھی وہ اس سے کام نہیں لیتا لہٰذا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ بظاہر یہ آیت کفار کے بارے میں ہے لیکن ایسے مسلمان جو اپنا معاملہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے (سچی توبہ کے ذریعے) درست نہیں کرتے' اُن کا معاملہ بھی بالآخر دل پر مہر اور گمراہی پر ہی تمام ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ عقیدے کی خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گناہ پر ڈٹے رہنا اور اپنی غلطی نہ ماننا شیطان کی خصلت ہے جبکہ اپنی خطا پر ندامت کے آنسو بہانا حضرت آدم علیہ السلام کی صفت ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے سب سے پہلے توبہ کا طریقہ ہمارے جدِّ امجد (حضرت آدم اور امّاں حوّا علیہما السلام) کو سکھایا تھا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید میں متعدد

مرتبہ بیان کیا گیا ہے‘ جس سے ابلیسیت اور آدمیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ندامت کے آنسو خطا کار کے لیے کتنا قیمتی اثاثہ ہیں‘ اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ روایات قابلِ غور ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((اَللّٰہُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِہٖ مِنْ اَحَدِکُمْ سَقَطَ عَلٰی بَعِیْرِہٖ وَقَدْ اَضَلَّہٗ فِیْ اَرْضِ فَلَاۃٍ))(۴)

’’اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے تم میں سے اس شخص کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوتا ہے‘ جس نے اپنا اونٹ پالیا ہو‘ حالانکہ اس نے اس کو ایک چٹیل میدان میں گم کر دیا تھا۔‘‘

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ))(۵)

’’گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔‘‘

((اِذَا تَابَ الْعَبْدُ اَنْسَی اللّٰہُ الْحَفَظَۃَ ذُنُوْبَہٗ وَاَنْسٰی ذٰلِکَ جَوَارِحَہٗ وَمَعَالِمَہٗ مِنَ الْاَرْضِ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰہَ وَلَیْسَ عَلَیْہِ شَاھِدٌ مِّنَ اللّٰہِ بِذَنْبٍ))(۶)

’’بندہ جب توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ ملائکہ (کراماً کاتبین) کو بھی بھلا دیتا ہے اور جن اعضاء سے گناہ ہوا تھا ان اعضاء سے بھی بھلا دیتا ہے‘ اور جہاں جہاں زمین پر گناہ ہوئے تھے زمین کے نشانات بھی مٹا دیتا ہے‘ یہاں تک کہ وہ شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے گناہ پر کوئی گواہی دینے والا نہ ہوگا۔‘‘

حضرت تھانویؒ اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمارے گناہوں کو مٹانے کے لیے ملائکہ کو بھی استعمال نہیں کیا بلکہ اپنی طرف نسبت فرمائی کہ اَنْسَی اللّٰہُ یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھلا دے گا۔ اس کا راز یہ ہے کہ فرشتے قیامت کے دن طعنہ نہ دے سکیں کہ تم تھے تو نالائق مگر ہم نے تمہاری خطاؤں کو مٹا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے احسان سے اپنے بندوں کو بچا لیا اور ان کی آبرو رکھ لی۔ دنیا کے حکمران ایسا نہیں کرتے‘ وہ اگر معاف بھی کرتے ہیں تو عدالتوں میں متعلقہ فرد کے جرم کا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ جس کو معافی دیتے ہیں‘ اس کے تمام گواہ اور دستاویزات سمیت تمام ریکارڈ ختم کر دیتے ہیں۔ کیا شان ہے اس کریم سلطان السلاطین کی! (بحواله التشرف بمعرفة احاديث التصوف)

ان فضائل کے بعد بھی اگر کوئی شخص ’’رجوع الی اللہ‘‘ میں کوتاہی کا ارتکاب کرے تو اس

سے بڑا نادان کوئی نہ ہوگا۔ اس کیفیت کا حصول کہ ”احساسِ گناہ“ پیدا ہو جائے‘ یہ کیسے ہوگا؟ ایسا نہیں ہوگا کہ ہم برے ماحول میں رہیں اور نیکوکار بھی بن جائیں۔ اچھے نتائج اُسی وقت برآمد ہوں گے جب انسان اچھی صحبت اختیار کرے گا۔ اچھی صحبت علمائے کرام اور اللہ والوں کی مجالس میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک بہتر صورت یہ بھی ہے کہ خطابِ جمعہ میں اہتمام کے ساتھ شرکت کو لازمی سمجھیں۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کا تشریحات کے ساتھ بغور مطالعہ کریں۔ خواتین کو ایسے مواقع عموماً کم حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا مَردوں کو چاہیے کہ اپنے اہل خانہ کی دینی تعلیم کے لیے وقت معین کریں‘ اور اس میں ناغہ نہ کریں۔ بچوں پر ان کے دوستوں کے حوالے سے بھی کڑی نظر رکھیں تاکہ وہ بُری صحبت سے محفوظ رہیں۔ اصل تیاری آخرت کی ہے‘ جس کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی۔ خدارا! اپنے بچوں کی دنیا ہی نہیں بلکہ آخرت بنانے کی بھی فکر کریں۔ آج کے بچے کل ملک وملت کے معمار بنیں گے۔ ان کی تعلیم و تربیت اسلامی خطوط پر ہوگی تو دُنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گے‘ ان شاء اللہ۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نبوی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پورے اخلاص کے ساتھ رجوع الی اللہ کی فکر کو ہمارے طرزِ عمل کا لازمی حصہ بنادے۔ آمین یا ربّ العالمین!

حواشی

(۱) صحیح مسلم: ۲۷۰۲

(۲) صحیح البخاری: ۶۳۰۷

(۳) سنن الترمذی: ۳۳۳۴

(۴) صحیح البخاری: ۶۳۰۹، صحیح مسلم: ۶۹۶۱

(۵) سنن ابن ماجة: 4250

(۶) جامع الصغیر، ج اول، ص ۲۱

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بچے: اقتدار سے زیادہ اہم!

خالد نجیب خان ☆

ابھی اسلام آباد کے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (PIMS) میں لگنے والی آگ کے نتیجے میں ۱۴ نومولود بچوں کے جاں بحق ہونے کی خبر کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ظالم ایک اور خبر لے آئے کہ مٹھی کے سول ہسپتال میں صرف آٹھ ماہ کے دوران ۴۸۰ نومولود بچے جاں بحق ہو گئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں بچوں کی موت بھی اب خبر نہیں رہی‘ صرف اعداد و شمار رہ گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام آباد میں اگر ایک نومولود کی سانس رک جائے تو خبر بنتی ہے‘ جبکہ مٹھی میں سینکڑوں بچوں کی سانسیں رُک جائیں تو شاید فائل بنتی ہے‘ رپورٹ بنتی ہے‘ اور پھر کسی میز کی دراز میں دفن ہو جاتی ہے۔

مٹھی تھرپارکر میں ہے‘ اسلام آباد سے سینکڑوں کلومیٹر دور۔ اتنی دور کہ وہاں کے بہت سے عام لوگ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ اسلام آباد میں آج کل کس کے بیان پر کس کی پریس کانفرنس ہو رہی ہے‘ کس نے کس کو دھمکی دی ہے‘ کس نے کس کے خلاف قرارداد لانے کا اعلان کیا ہے اور کس صوبے کو کس سے بچانے کے لیے سیاسی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ البتہ اسلام آباد میں اقتدار کے ایوانوں کو یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ مٹھی میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی پہلی ضرورت کسی سیاسی نعرے‘ کسی قرارداد‘ کسی پریس کانفرنس یا کسی انتخابی جلسے کی نہیں ہوتی: اسے دودھ‘ دوا‘ آکسیجن‘ ڈاکٹر اور ایک محفوظ ہسپتال چاہیے۔

مٹھی کے سول ہسپتال کے ریکارڈ کے حوالے سے سامنے آنے والی تفصیلات نہایت پریشان کن ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ جنوری سے اگست ۲۰۲۶ء تک ۲۷۳۲ بچوں کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اِن میں سے ۱۳۸۷ بچوں کو صحت یاب ہونے پر ڈسچارج کیا گیا‘ جبکہ ۱۰۶ کو مزید علاج کے لیے دوسرے ہسپتالوں میں ریفر کیا گیا۔ باقی بچوں کا کیا ہوا؟ موصول ہونے

☆ معاون مرکزی شعبہ نشر و اشاعت

والے اعداد وشمار اس سوال کا جواب نہیں دیتے۔ اگر یہی اعداد وشمار درست ہیں تو ۱۲۳۹ بچوں کا حساب باقی رہ جاتا ہے جن میں سے ۴۸۰ تو اللہ کے پاس پہنچ گئے مگر باقی نہ گھر پہنچے نہ کہیں اور۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے کسی سیاسی تقریر‘ کسی سرکاری وضاحت یا کسی رسمی بیان کے ذریعے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری دعا ہے کہ یہ بچے بھی صحت یاب ہو کر گھروں کو لوٹنے والوں میں ہی شامل ہوں‘ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر معاملہ اعداد وشمار کے ایسے گورکھ دھندے کا ہے جس کی سنگینی کا اندازہ شاید ابھی ہم نے لگایا ہی نہیں۔

۴۸۰ بچوں کی اموات کا عدد درست خیال کرتے ہوئے ہی ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ جنوری سے اگست تک ۲۴۳ دن میں اوسطاً دو نومولود روزانہ موت کے منہ میں گئے۔ یعنی ہر روز دو خاندان اپنے بچوں کی موت کا غم لے کر واپس جاتے رہے۔ ذرا تصور کیجیے‘ اگر اسلام آباد‘ لاہور‘ کراچی یا کسی بڑے شہر کے کسی معروف ہسپتال میں مسلسل آٹھ ماہ تک روزانہ تقریباً دو نومولود بچے مر رہے ہوتے تو کیا ہمارا قومی ضمیر اتنا ہی خاموش رہتا؟ یقیناً نہیں! لیکن مٹھی میں ایسا ہوتا ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ تھر تو ویسے ہی پس ماندہ ہے۔ یہ ’’ویسے ہی‘‘ بڑا ظالم لفظ ہے۔

تھر میں غذائی قلت ہے‘ ماؤں کی غذا ناقص ہے‘ کم عمری کی شادیاں ہیں‘ وبائی امراض ہیں‘ غربت ہے‘ دور دراز بستیاں ہیں‘ صحت کی سہولتوں کی کمی ہے۔ یہ سب ایسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام مسائل آسمانی فیصلے ہیں جنہیں بدلنے کی کوئی انسانی کوشش نہیں کی جا سکتی؟ کیا غذائی قلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا؟ کیا حاملہ خواتین کو مناسب خوراک نہیں دی جا سکتی؟ کیا بنیادی مراکز صحت کو فعال نہیں کیا جا سکتا؟ کیا تربیت یافتہ دائیوں‘ نرسوں اور ڈاکٹروں کی دستیابی یقینی نہیں بنائی جا سکتی؟ کیا نومولود بچوں کے لیے ضروری ادویات‘ آکسیجن اور طبی آلات فراہم نہیں کیے جا سکتے؟ کیا دور دراز علاقوں میں زچہ و بچہ مراکز قائم نہیں ہو سکتے؟ اگر اِن سوالوں کا جواب ’’ہاں‘‘ ہے تو پھر سوال بیماری کا نہیں‘ ترجیحات کا ہے‘ اور ترجیحات کا تعلق براہ راست اقتدار سے ہوتا ہے۔

تھرپارکر سندھ کے اُن دور دراز علاقوں میں شمار ہوتا ہے جہاں ریاست کی موجودگی کا احساس بعض اوقات انتخابات کے موسم میں زیادہ اور باقی دنوں میں کم ہوتا ہے۔ یہاں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے جبکہ ایک بڑی تعداد ہندو برادری سے تعلق رکھتی ہے۔ قومی اسمبلی میں

اِس علاقے کی نمائندگی بھی برسوں سے سیاسی طور پر اہم رہی ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ قومی اسمبلی میں کون بیٹھا ہے‘ صوبائی اسمبلی میں کون منتخب ہوا ہے یا کس جماعت کا امیدوار کامیاب ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس علاقے کے لوگوں نے اپنے نمائندے منتخب کر کے اسلام آباد اور کراچی بھیجے‘ اُن کے بچوں کو زندگی کی بنیادی ضمانت کیوں نہیں مل رہی؟ ’’بھٹو زندہ ہے‘‘ کے نعرے اپنی جگہ‘ مگر تھر کا وہ بچہ جس کی سانس علاج نہ ملنے کے باعث رُک جائے‘ وہ کس نعرے کے سہارے زندہ ہوگا؟ اگر بھٹو واقعی زندہ ہے تو اُسے اِس سوال کا جواب ضرور دینا ہوگا کہ اُس کے نام پر کئی دہائیوں سے سیاست کرنے والوں کے زیر اقتدار صوبے کے ایک دور افتادہ علاقے میں بچے کیوں مر رہے ہیں؟

سندھ کی تقسیم کا سوال اُٹھتا ہے تو سیاسی قیادت فوراً متحرک ہو جاتی ہے۔ صوبے کی وحدت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ قراردادوں کی بات ہونے لگتی ہے۔ بیانات جاری ہوتے ہیں۔ تاریخ یاد دلائی جاتی ہے۔ جغرافیہ سمجھایا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والے کو اچانک احساس ہوتا ہے کہ صوبہ اُس کے بغیر ادھورا ہے۔ چند روز قبل وزیر اعلیٰ سندھ مراد علی شاہ نے بھی کہا کہ اگر کسی میں ہمت ہے تو سندھ کی تقسیم کی قرارداد لا کر دکھائے۔ جب تک ایک بھی رکن زندہ ہے‘ صوبہ تقسیم نہیں ہوگا۔ ہم اس بحث کے سیاسی پہلو میں نہیں جاتے۔ سندھ ایک صوبہ ہے۔ اس کی تاریخی‘ ثقافتی اور سیاسی شناخت اپنی جگہ اہم ہے۔ صوبوں کی تشکیل یا تقسیم آئینی‘ جمہوری اور عوامی عمل کے ذریعے ہونی چاہیے۔ البتہ ایک سوال بہرحال پوچھا جا سکتا ہے کہ صوبہ کس کے لیے ہوتا ہے؟ کیا صوبہ نقشے پر ایک لکیر کا نام ہے؟ کیا صوبہ اسمبلی کی نشستوں کا مجموعہ ہے؟ کیا صوبہ اقتدار کی تقسیم کا نام ہے؟ یا صوبہ دراصل اُن انسانوں کا نام ہے جو اس خطے میں رہتے ہیں؟ اگر صوبے کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی سرحدیں تو سلامت رہیں لیکن اُس کے دور افتادہ علاقوں میں بچے مرتے رہیں تو ہمیں اپنی ترجیحات پر دوبارہ غور کرنا ہوگا۔

ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ زیادہ اہم کیا ہے: صوبہ بچانا یا صوبے کے بچے؟ یہ سوال صرف سندھ سے متعلق نہیں۔ یہی سوال بلوچستان‘ خیبر پختون خوا‘ پنجاب‘ گلگت بلتستان‘ آزاد کشمیر اور پاکستان کے ہر اُس علاقے سے متعلق ہے جہاں ریاست کے وسائل اور شہری کی ضرورت کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ صوبے بڑے ہوں یا چھوٹے‘ دارالحکومت قریب ہو یا دور‘

حکومت کسی ایک جماعت کی ہو یا دوسری کی‘ بنیادی سوال وہی رہتا ہے: شہری کو زندگی کی بنیادی سہولت کب ملے گی؟

یہاں ایک اور تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ پاکستان میں صوبوں کی تقسیم کی بحث روز بروز شدت اختیار کر رہی ہے۔ ہر صوبے میں کچھ لوگ انتظامی بنیادوں پر نئے صوبوں کے قیام کو بہتر حکمرانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں‘ جبکہ کچھ سیاسی جماعتیں اِسے اپنی سیاسی قوت کے لیے خطرہ تصور کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو جماعتیں ایک صوبے میں نئے صوبوں کی حمایت کرتی ہیں‘ دوسرے صوبے میں اُسی مطالبے کو ملک دشمنی یا صوبہ دشمنی قرار دینے لگتی ہیں۔ گویا اصول وہ نہیں ہوتا جو درست ہو‘ اصول وہ ہوتا ہے جو اُس وقت ہمارے مفاد میں ہو۔ نئے صوبے اگر صرف اس لیے بنائے یا نہ بنائے جائیں کہ کس سیاسی جماعت کو کتنا فائدہ ہوگا تو پھر یہ عوام کا نہیں‘ اقتدار کا مسئلہ ہے۔ اقتدار کے بارے میں ہمارا ایمان اس سے کہیں زیادہ واضح ہے جتنا ہماری سیاست نے اِسے بنا دیا ہے۔ اقتدار کسی انسان‘ خاندان‘ جماعت یا نسل کی جاگیر نہیں۔ قرآن مجید ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ یعنی اقتدار انعام سے زیادہ امتحان ہے۔

دین تو اقتدار کو ذِمہ داری قرار دیتا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ سے منسوب یہ مشہور قول کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجھ سے اُس کے بارے میں سوال کرے گا‘ ہمارے حکمرانوں کے لیے محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ حکمرانی کا ایک اخلاقی معیار ہونا چاہیے۔ ذرا اس معیار کو سامنے رکھ کر آج کے حکمران اپنے دفتر میں بیٹھ کر سوچیں۔ مٹھی میں مرنے والا بچہ کس کا ذمہ ہے؟ وہ بچہ جو غذائی قلت کا شکار ہوا‘ کس کا ذمہ ہے؟ وہ ماں جو مناسب طبی سہولت کے بغیر بچے کو جنم دیتی ہے‘ کس کی ذمہ داری ہے؟ اگر ہسپتال پہنچنے کے بعد بھی اس کے بچے کو مناسب علاج نہیں ملتا تو وہ کس دروازے پر دستک دے؟ سرکاری ہسپتالوں میں نوزائیدہ بچوں کی نرسریوں میں ہونے والی آتشزدگیوں میں جاں بحق ہونے والے بچے کس کی ذمہ داری ہیں؟

ایک طرف ہم اربوں‘ کھربوں روپے کے ریکارڈ خسارے کے بجٹ بناتے ہیں‘ ترقیاتی منصوبوں کا افتتاح کرتے ہیں۔ سیاسی اجتماعات میں قومی ترقی کے دعوے کرتے ہیں جبکہ

دوسری طرف ایک ماں اپنے نومولود بچے کو محض اس لیے نہیں بچا پاتی کہ ہسپتال میں وہ سہولت موجود نہیں جس کی لاگت شاید کسی بڑے منصوبے کے ایک معمولی حصے سے پوری ہو سکتی تھی۔ اگر ہم نے ترقی کے تمام پیمانے بنا لیے لیکن ایک غریب بچے کی زندگی کو محفوظ نہ بنا سکے تو پھر ہمیں اعداد و شمار میں ترقی یافتہ اور حقیقت میں ناکام معاشرہ کہلوانے میں شرم محسوس نہیں ہونی چاہیے۔

ریاستی ذِمّہ داریوں کو اللہ کے کھاتے میں ڈال دینا توکّل نہیں‘ بدانتظامی ہے۔ ایسے واقعات کا یہ جواز دینا غلط ہے کہ تھر میں غربت اور پس ماندگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ غربت کم کرنے کے لیے گزشتہ برسوں میں کیا کیا گیا؟ یہ کہنا غلط ہے کہ وہاں غذائی قلت ہے۔ سوال یہ ہے کہ غذائی قلت کے خاتمے کے لیے مختص وسائل کہاں خرچ ہوئے؟ یہ کہنا غلط ہے کہ ہسپتال دور ہے۔ سوال یہ ہے کہ موبائل ہیلتھ یونٹس‘ ایمبولینسز اور بنیادی مراکز صحت کیوں مؤثر نہیں؟

صوبے تقسیم ہوں یا نہ ہوں‘ اس پر بحث ہوتی رہے گی۔ نئی انتظامی اکائیاں بنیں یا موجودہ صوبے برقرار رہیں‘ اس پر بھی دلائل آتے رہیں گے۔ سیاسی جماعتیں اپنی اپنی مصلحت کے مطابق موقف بدلتی رہیں گی۔ البتہ ایک چیز پر تو کم از کم اتفاق ہو سکتا ہے: ’’بچے نہیں مرنے چاہئیں!‘‘ مٹھی میں‘ نہ چھِپڑ میں‘ نہ پاکستان کے کسی ایسے کونے میں جہاں ایک ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر ریاست کی طرف اُمید سے دیکھ رہی ہو۔

حکمرانو! صوبوں کے نقشے یاد رکھنے سے پہلے اُن ماؤں کے چہرے یاد رکھو جن کی گودیں تمہارے مقاصد کے حصول میں اُجڑ جاتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تاریخ حکمرانوں کے بنائے ہوئے نقشے بھول سکتی ہے‘ سیاسی جماعتوں کے نعرے بھول سکتی ہے‘ انتخابی منشور بھول سکتی ہے مگر ایک بے گناہ بچے کی موت کا سوال شاید کبھی نہیں بھولتی۔ آخرت میں تو نقشے بھی نہیں ہوں گے‘ نعرے بھی نہیں ہوں گے‘ جماعتیں بھی نہیں ہوں گی‘ عہدے بھی نہیں ہوں گے۔ وہاں صرف اعمال ہوں گے اور ان اعمال کی جواب دہی ہوگی!

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

قدیم انگلینڈ میں بیویوں کی خرید وفروخت

رضی الدین سید

آج انگلینڈ سمیت تمام مغربی دنیا میں عورتوں کے حقوق کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ عورت کو مرد کے سر کا تاج مانا جا رہا ہے اور ان کی حدود وسیع کرنے کی خاطر بہت سارے قدیم قوانین ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے گئے ہیں۔ ایسے میں چند صدیاں پیچھے جا کر اُس دور کی مظلوم خواتین کی تاریخ دیکھنی چاہیے کہ ان کے ساتھ کس قدر نفرت انگیز سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ایک جیتی جاگتی ہستی جس کے سینے میں دل اور سر میں ایک دماغ تھا‘ جس کی فطرت بھی کچھ حقوق مانگتی تھی اور جو اپنے لیے کسی تحفظ کی بھی طلب گار تھی‘ وہ ایک بے کار شے سمجھی جاتی تھی۔ اس کے اور غلاموں کے درمیان کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ نہ صرف عام خواتین‘ بلکہ ملکاؤں تک کے ساتھ یہ جبر اور بربریت بلا کسی شرم وحیا کے جائز سمجھی جاتی تھی۔ یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی‘ عیسائی بادشاہ اپنی بیویوں کو بلاوجہ قتل کر دیتے تھے یا ملکہ ہونے کے باوجود غلام سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے۔ اس کے برعکس اسلام کا یہ مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اس کی یہ تعلیم ہی نہیں کہ عورت کو خرید وفروخت والی جنس سمجھا جائے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں عورت کا مقام اور اس کے حقوق ہمیشہ سے واضح ہیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ اس قسم کے گھناؤنے اور دردناک قصوں سے یکسر پاک ہے۔ اسلام خواتین کے لیے ایک دینِ رحمت ثابت ہوا‘ جس نے انہیں مَردوں ہی کی مانند ایک مکمل وجود اور قابلِ احترام شخصیت دے کر مکمل حقوق دیے۔

یہ تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے کہ برطانیہ میں سترھویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے آغاز تک بیویاں باقاعدہ فروخت ہوا کرتی تھیں۔ اس ضمن میں ملکہ وکٹوریہ کا دور بہت معروف ہے۔ یہ تب ہوتا تھا جب میاں بیوی میں اختلافات نفرت کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ طلاق بھی اس کا ایک حل تھا‘ لیکن اس میں قانونی پیچیدگیاں بہت تھیں اور عام افراد نہ صرف اس

ای میل: national.a.research@gmail.com

کے اخراجات ادا نہیں کر سکتے تھے بلکہ بیوی پر زنا کے جھوٹے الزام پر شوہر کو جیل بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ واضح رہے کہ توراتی قانون کے تحت میاں بیوی میں علیحدگی صرف بدکاری کے جرم میں ہو سکتی ہے۔ دولت مند طبقہ ہی طلاق کے جرمانے ادا کرنے کے قابل تھا‘ اس لیے ایک دوسرے سے تعلق توڑنے کی خاطر یہ جوڑے باہمی رضامندی سے فروخت کا قدم اٹھاتے تھے۔ بیوی باقاعدہ اجازت دیتی تھی کہ اسے کسی اور کے ہاتھوں فروخت کر کے اس کی جان چھوڑ دی جائے۔ اس طریقے سے مرد کو طلاق کی بھاری رقم کی ادائیگی سے بھی بچاؤ ہو جاتا تھا اور کسی ایک فریق کے قتل ہونے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے تھے۔ طریقہ یہ ہوتا تھا کہ بیوی کی گردن‘ کمر اور بازوؤں کے گرد لگام جیسی رسّی باندھ کر شوہر اسے کسی جانور کی مانند مارکیٹ میں لے کر جاتا تھا اور کسی درخت یا جنگلے سے اس کی لگام کو باندھتا یا سب کے سامنے گھماتا پھراتا تھا۔ اس کے بعد اس کی نیلامی کی جاتی تھی۔ مرد حضرات اس کا معائنہ کرتے اور سودے بازی کرتے‘ جس کے بعد بیوی طے شدہ قیمت پر فروخت ہو کر نئے خریدار کے پاس چلی جاتی تھی۔

سودے کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا تھا کہ مذکورہ عورت کا سابق شوہر سے تعلق اب ختم ہو گیا ہے اور فلاں شخص اس کا نیا قانونی شوہر ہے۔ قدیم رومن قوانین میں کسی داشتہ کو اپنی بیوی قرار دینے کے لیے لازمی تھا کہ اس کا دوست کسی دن بہت سے لوگوں کے سامنے داشتہ کے چہرے پر نقاب ڈال دے اور کہے کہ آج سے یہ میری بیوی ہے۔ اگر اس نے یہ عمل سب کے سامنے نہیں کیا اور بس اکیلے ہی میں اعلان کر دیا کہ یہ میری بیوی ہے تو وہ قانونی طور پر اس کی بیوی نہیں گردانی جاتی تھی۔ اگرچہ برطانوی قانون اس کے برعکس تھا اور ایسے عمل کی سزا بھی مقرر تھی‘ لیکن قانون بس ڈھیلا ڈھالا ہی تھا اور حکام اس سے چشم پوشی ہی کرتے تھے۔ ایک مجسٹریٹ کا تو علی الاعلان کہنا تھا کہ وہ نہیں سمجھتا کہ اس عمل پر کوئی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اخبارات کے اِجراء کے بعد تو بیویوں کی خرید و فروخت کا یہ کاروبار پھیلتا ہی چلا گیا۔ کبھی کبھی تو یہ عمل اخبارات میں باقاعدہ اشتہارات کے ساتھ بھی انجام پاتا تھا۔ اگر کبھی کسی عورت کا بچہ ساتھ ہوتا تو خاتون کے ساتھ وہ بچہ بھی کسی اور کے پاس چلا جاتا تھا‘ جس کی قیمت عورت سے بہت کم رکھی جاتی تھی۔ اُس دور میں چونکہ عورت کو شوہر کی ملکیت ہی سمجھا جاتا تھا اس لیے یہ اس کا جائز حق مانا جاتا کہ اپنی بیوی کو وہ عام ملکیت کی مانند کہیں بھی فروخت کر دے۔ اس کاروبار کے لیے

باقاعدہ مارکیٹیں وجود میں آچکی تھیں جہاں رش پایا جاتا تھا۔

ایک برطانوی قانون دان اور تاریخ نویس ''جیمس برائس'' نے ۱۹۰۱ء میں لکھا کہ یہ کاروبار اُس کے اپنے دور تک بھی جاری تھا۔ حتیٰ کہ ایک عورت نے ''لیڈز پولیس'' کے سامنے اقرار کیا کہ اس کے شوہر نے اسے اپنے دوست کو صرف ایک پاؤنڈ میں بیچا ہے۔ عورت کی قیمت توہین آمیز حد تک گری ہوئی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ محض تین شلنگ میں بھی بک جاتی تھی۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے والے ایک مصنف ''بیرنگ گولڈ'' نے اپنی کتاب میں پورا ایک باب ہی اس موضوع پر تحریر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اپنے بچپن میں اس نے ایک شاعر کو دیکھا کہ مارکیٹ سے وہ ایک عورت کے ساتھ لوٹ رہا ہے اور اسے اپنی بیوی کہہ رہا ہے۔ بتا رہا ہے کہ سودا بہت مناسب طور پر ہوا کیونکہ وہ مذہب اور قانون' دونوں کے عین مطابق تھا۔ انیسویں صدی کے ایک جج کا یہ تبصرہ ریکارڈ پر ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بیویوں کی فروخت روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بیویوں کی خرید وفروخت کا یہ سلسلہ انگلینڈ سے ہوتا ہوا آسٹریلیا' فرانس اور امریکہ تک پھیل چکا تھا۔ اُس وقت کے بادشاہ اپنے عوام پر اس قدر زیادہ ٹیکس اور مالی بوجھ لاد دیتے تھے کہ غریب' غریب تر ہوجاتا تھا اور سرکاری رقم کی ادائیگی کے لیے مجبور ہوکر نہ صرف اپنی بیوی کو مارکیٹ میں فروخت کرتا تھا بلکہ اپنے بچوں کو بھی۔

جیسے جیسے شعور بیدار ہوتا گیا' بیویوں نے اعتراضات شروع کر دیے۔ تاہم مسئلہ حل ہونے کا امکان نہیں تھا' کیونکہ مذہبی عدالتوں میں طلاق کا حصول بہت مہنگا' طویل اور تکلیف دہ تھا۔ اس لیے بیویوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہی رہا۔ کمزور مالی حیثیت اور سخت مزاج شوہروں والی عورتیں تو اصرار کرتی تھیں کہ گھریلو تشدد کی وجہ سے انہیں فروخت ہی کر دیا جائے۔ ایسے ہی ایک سودے میں ہوتے ہوتے بیوی کا آخری دام پانچ شلنگ ہی لگ سکا۔ بیوی کو وہ آدمی اچھا نہیں لگا تو دام مزید گر گئے اور کسی دوسرے نے اسے محض تین شلنگ ہی میں خرید لیا۔ ایک بار لندن کے کسی دوکاندار نے اپنی بیوی کو کسی اور کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا تو بجائے غصے میں آنے کے اُس کے آشنا سے کہا کہ وہی اس عورت کو خرید لے' اور اس طرح یہ سودا مکمل ہوگیا۔ کسی کی بیوی کا رضا کارانہ طور پر کسی اور کی بیوی بن جانے کا عمل بھی بہت عام تھا۔ کبھی کبھی بیوی اپنے شوہر سے اس قدر بیزار ہوجاتی کہ کسی غریب خریدار کو قیمت خود ہی دے

دیتی تاکہ وہ اسے اس کے شوہر کو ادا کر سکے۔

اُس دور تک عیسائیت میں تحریری نکاح نامہ بھی نہیں ہوتا تھا' جبکہ شادی کے لیے مناسب عمر لڑکے کے لیے ۱۴ سال اور لڑکی کے لیے ۱۲ سال سمجھی جاتی تھی۔ ۱۷۵۳ء تک شادیاں نہ تو گرجاؤں میں ہوتی تھیں اور نہ نکاح نامہ تیار کیا جاتا تھا۔ شادی کے بعد بیوی کی تمام آمدنی و جائیداد' اگر کوئی ہو تو از روئے قانون شوہر کی ملکیت بن جاتی تھی۔ عورت کو کسی قسم کا مالی اختیار نہ تھا۔ حال یہ ہو گیا تھا کہ کلیسا نے بھی اسے ایک ''ناگزیر برائی'' کے طور پر قبول کیا ہوا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں' جبکہ بیشتر مرد جنگ کے لیے رخصت ہو گئے تھے اور ان کی واپسی کا امکان نہ رہا تھا' بیویاں خود بھی اپنے آپ کو بیچنے کے لیے نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ سات سال تک غائب رہنے کا عرصہ طلاق کے لیے قانونی سمجھا جاتا تھا' مگر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس عرصے کے بعد جب شوہر واپس آتا تو اپنی بیوی کو کسی اور کے گھر پاتا۔ پھر وہ نئے شوہر سے اس کی کوئی قیمت وصول کر کے اسے گویا قانونی علیحدگی دے دیتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیوی خریدنے والے کے پاس پوری رقم نہیں ہوتی تھی اور وہ قسطوں میں ادائیگی کی درخواست کرتا۔ پھر ایک لڑائی جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک طرف شوہر بیوی کو کھینچ رہا ہوتا اور دوسری جانب نیا خریدار اپنی جانب کھینچ رہا ہوتا۔ یہ صورت حال دیکھ کر کبھی کبھی ہمدرد لوگ بقیہ قیمت سابقہ شوہر کو ادا کر دیتے تھے اور یوں بیچاری بیوی اس کھینچا تانی کے بعد اپنے نئے ''شوہر'' کے ساتھ رخصت ہو جاتی تھی۔ برطانوی تاریخ کا یہ باب اس قدر بدنما و مضحکہ خیز ہے جسے کبھی مٹایا نہ جا سکے گا۔ مغرب سے مکالمہ کرتے ہوئے ہمیں لازماً ان کی عورتوں کی اس شرم ناک بے بسی کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مغرب میں عورت کا مقام آج بھی اس قدیم حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وہ سب کی ہو کر بھی کسی کی نہیں ہے۔ تنہائی کے صحرا میں وہ آج بھی لاچار و بے سہارا کھڑی ہے۔ حقوق کی بھرمار کر دینے کے نام پر ان کے مَردوں نے کمال ہوشیاری سے انہیں ایک جدید شکل میں بارِ دگر غلام اور بکنے والی شے بنا کے رکھ دیا۔ انٹرنیٹ پر اس موضوع پر اس قدر مواد موجود ہے کہ ان گوری چمڑی والوں کے کالے کرتوت اظہر من الشّمس ہو جاتے ہیں۔

❁❁❁

PHARMA

Your Health
Our Devotion

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com

Oct 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore